تعمیر انسانیت

مخلوط اجتماعات میں کی گئی تقریروں کا مجموعہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مرتب

عبدالہادی اعظمی ندوی

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

محرم الحرام ۱۴۳۵ھ - نومبر ۲۰۱۳ء

کتاب	:	تعمیر انسانیت
مصنف	:	حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
ترتیب	:	عبدالہادی اعظمی ندوی
صفحات	:	۱۶۸
تعداد	:	ایک ہزار (۱۰۰۰)
قیمت	:	Rs. 130

باہتمام: محمد نفیس خاں ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، رائے بریلی

☆ مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ☆ الفرقان بکڈپو، نظیرآباد، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ الجدیدۃ، ندوہ روڈ لکھنؤ

ناشر :

سیّد احمد شہیدؒ اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

فہــــرست

انسان خود پرست بھی ہے خود فراموش بھی
(۴۵-۵۶)

دنیا کی موجودہ کشمکش یہ نہیں کہ برائی دور ہو بلکہ یہ کہ برائی ہماری نگرانی اور انتظام میں ہو۔ (۵۷-۶۵)

اعلیٰ اخلاقی قدریں دل کے اندر کھوئی ہیں ان کی باہر تلاش ہے

(۶۶-۷۶)

نفس پرستی یا خدا پرستی

(۷۷-۹۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

۱۹۴۰ء کے آغاز میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے نظام الدین کا پہلا سفر کیا تھا، اور وہیں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ مولانا نے پہلی ہی ملاقات میں بڑی محبت واپنائیت اور اکرام واعتماد کا معاملہ فرمایا۔ اس کے بعد سے ۱۹۵۰ء کے بعد تک مسلسل حضرت مولانا پورے ملک کے تبلیغی ودعوتی دورے فرماتے رہے، مختلف علاقوں میں کام کی بنیاد پڑی، لوگوں میں دعوتی جذبہ پیدا ہوا اور کام پھیلنے لگا۔ مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ کو بھی حضرت مولانا سے بڑا تعلق تھا، اور وہ حضرت مولانا کی کوششوں کو بڑی قدر وعظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حضرت مولانا کا یہ خیال پہلے بھی تھا کہ برادران وطن کی اکثریت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، تبلیغی کوششوں کے دوران مولانا نے اس کو اور زیادہ محسوس کیا، تبلیغ کے ذمہ داروں کو بھی حضرت مولانا نے اس کی طرف توجہ دلائی، لیکن بعد میں مولانا کو اندازہ ہو گیا کہ نظام الدین سے اس کام کے آغاز میں مشکلات سامنے آسکتی ہیں اور وہاں سے جو کام جاری ہے اس پر بھی زد پڑ سکتی ہے، اس لیے حضرت مولانا نے اپنے طور پر اس کام کو مناسب سمجھا اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ اور مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ کی اجازت ومشورہ سے لکھنؤ میں تبلیغی کام کے ساتھ اس کو بھی جوڑ لیا، پھر مسلسل کئی سال مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی رفاقت میں یہ کام جاری رہا۔

لکھنؤ کا مرکز تبلیغ ہی اس کام کا مرکز تھا، طریقۂ کار تبلیغی نظام سے قریب تر تھا بلکہ اس کا اکثر

حصہ نظام الدین کے طریقے کے مطابق ہی تھا، البتہ اس میں ایک نئی شق کا اضافہ یہ کیا گیا تھا کہ مختلف علاقوں میں ہندو مسلم مخلوط اجتماعات کیے جاتے تھے، اور اس میں زندگی کے مسائل پر نئے طرز سے سوچنے اور نئے طریقہ پر کوشش کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔

ان اجتماعات میں حضرت مولانا نے بڑی طاقتور اور مؤثر تقریریں فرمائیں جن سے حالات پر بہت اچھا اثر پڑا اور خاص طور پر غیر مسلم اکثریت کے دماغوں میں اسلام کے بارے میں جو شبہات بڑھتے جارہے تھے ان کا بڑی حد تک ازالہ ہوا، اور وہ اسلام سے قریب ہوئے۔

یہ اجتماعات ملک کے مختلف شہروں میں کیے گئے، لکھنؤ کو چونکہ مرکزیت حاصل تھی اس لیے وہاں متعدد پروگرام ہوئے، صوبہ اتر پردیش کے اکثر و بیشتر بڑے شہروں میں یہ پروگرام منعقد ہوئے۔ حضرت مولانا ان اجتماعات کی ضرورت اور مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''نہ صرف ہندوستان بلکہ اس موجودہ دور اور عالم انسانی کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ اغراض و تعصّبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالکل آزاد اور بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی جائیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے، اور جن کو نظر انداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدن اور پوری انسانی سوسائٹی اس وقت سخت خطرہ سے دوچار اور موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار ہے۔''

اس کی افادیت اور کامیابی پر روشنی یوں ڈالتے ہیں:

''تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی، یہ جلسے ہم سب کی توقع اور اندازہ سے بہت بڑھ کر کامیاب ہوئے، ان میں ہزاروں مہذب اور تعلیم یافتہ شہریوں کا مجمع ہوا، جس نے اتنے سکون و اطمینان اور رغبت اور دلچسپی سے تقریریں سنیں جس پر سیاسی کارکنوں کو بھی حیرت ہوئی۔ پھر معزز سامعین نے اپنے تاثرات کا اظہار اس انداز میں کیا جس سے عمل اور دعوت کا ایک نیا میدان سامنے آ گیا اور معلوم ہوا کہ ہمارے ملک میں صداقتوں اور حقیقتوں کے سمجھنے کی کتنی استعداد اور صلاحیت موجود ہے، اور خود غرض قومی و سیاسی

تحریکوں نے عام آدمیوں کو کتنا مایوس کر دیا ہے، نیز یہ کہ اندھی اور بے ضمیر مادیت کے خلاف کتنا جذبہ اور کیسا اضطراب پایا جاتا ہے، یہ اس ملک اور اس دور کے لیے ایک فال نیک ہے اور امید کی ایک بہت بڑی شعاع۔''

ان مخلوط اجتماعات کا سب سے پہلا باقاعدہ اجتماع حضرت مولانا کے سفر شام (۱۹۵۰ء) کے بعد ہوا تھا، امین الدولہ پارک امین آباد (لکھنؤ) میں جو اہم جلسوں کے لیے سب سے بڑی جگہ تھی یہ اجتماع منعقد ہوا، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس میں سامعین کی اتنی بڑی تعداد تھی جو بڑے بڑے سیاسی جلسوں میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس میں حضرت مولانا نے خدا پرستی اور نفس پرستی کے عنوان سے تقریر کی، جس میں ثابت کیا کہ یہ دو متوازی فلسفۂ حیات ہیں جنھوں نے دنیا کو تقسیم کر رکھا ہے، پھر حضرت مولانا نے دنیا پر پڑنے والے ان دونوں کے مختلف اثرات اور نتائج کا ذکر فرمایا۔ تقریر میں ایسا جوش اور روانی تھی کہ مجمع پر سکتہ کا عالم طاری تھا، رکشے والوں نے سواریاں لینے سے انکار کر دیا تھا اور بے خود ہو کر تقریر سن رہے تھے۔ اس پہلے جلسہ نے لکھنؤ کی فضا پر گہرا اثر ڈالا اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس موضوع پر حضرت مولانا کے خطابات بڑے پر مغز اور مؤثر ہوتے تھے، افسوس ہے کہ وہ سب محفوظ نہ رہ سکے۔

البتہ ۵۴ء اور ۵۵ء کی تقریریں جو صوبۂ اتر پردیش کے مختلف بڑے شہروں میں ہوئیں محفوظ رہ گئیں اور ان کے مجموعے ''مقام انسانیت'' اور ''پیام انسانیت'' کے عنوان سے منظر عام پر آئے۔

ان تقریروں کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ تقریر کا اختتام ایسے مضمون پر ہوتا تھا جس سے آسمانی ہدایت کی ضرورت، نبوت کی قدر و منزلت اور اسلام کی جستجو اور تلاش کا جذبہ پیدا ہو۔ ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

''اللہ کے پیغمبروں نے خواہشات پر پہرے بٹھائے، خواہشات میں توازن اور اعتدال پیدا کیا، نفسانی خواہشات کے بجائے اللہ کو راضی کرنے کی زبردست خواہش پیدا کی، انسانی

ہمدردی اور غمگساری کا جذبہ پیدا کیا۔"

"ہم لوگوں میں اس جذبہ کو پیدا کرنا چاہتے اور ان میں ان حقیقتوں کی پیاس پیدا کرنا چاہتے ہیں، زندگی محض کھانے پینے کا نام نہیں، انسان کی زندگی محض مادی یا حیوانی زندگی کا نام نہیں۔ ہم ایک نیا ذوق لے کر آئے ہیں، آج کی مادی دنیا میں یہ بات نئی ہے، دراصل یہ بات نئی نہیں، دنیا کے سب پیغمبر جو ہر قوم میں آئے، یہی پیغام لائے اور سب سے زیادہ طاقت اور وضاحت کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری طور پر یہ بات کہی۔ یہ حقیقت چوراہوں پر کہنے کے لائق ہے، لوگ پیٹ کے گرد چکر لگا رہے ہیں، اصلی زندگی دم توڑ رہی ہے، انسانیت کی پونجی لٹ رہی ہے۔ ہم ایک صدا لگانے آئے ہیں، حق کی صدا، دنیا اس صدا سے نامانوس ہے، مگر ہم دنیا سے مایوس نہیں، انسانوں کے پاس اب بھی ضمیر ہے، یہ ضمیر مردہ نہیں ہوا، اس پر گرد وغبار آ گیا ہے، اگر وہ گرد وغبار جھاڑ دیا جائے اور اس کو آلودگی سے صاف کر دیا جائے تو اب بھی اس کی گنجائش ہے کہ وہ حق کو قبول کر لے اور اس میں ایمانی شعور پیدا ہو"۔

ان تقریروں کی تاثیر وافادیت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا نے "کاروان زندگی" میں ایک واقعہ تحریر فرمایا ہے، اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے :

"ایک مرتبہ تو یہ پیش آیا کہ سیوان میں شب کے مخلوط اجتماع میں حسب معمول تقریر کر کے بیٹھنا چاہتا تھا کہ جلسہ سے آوازیں آئیں کہ ابھی اور فرمایئے ہم ابھی سننا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم لوگوں کا یہ معمول نہیں کہ جب بات پوری ہو جائے تو بلا ضرورت تقریر جاری رکھیں۔ میں یہ کہہ کر بیٹھ ہی رہا تھا کہ ایک سن رسیدہ ہندو اسٹیج پر Wonderful-Wonderful کے الفاظ کہتے ہوئے آگے بڑھے اور کہا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ہم لوگوں نے اس اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں اس جلسہ میں کوئی انتشار یا خیالات کا تضاد سامنے نہ آئے، ان کو مہذب طریقہ پر بٹھانے کی کوشش کی، لیکن وہ اسٹیج تک پہونچ گئے۔ معززین شہر نے بتایا کہ یہ یہاں کے بہت کامیاب وکیل اور یہاں کی پرجا سوشلسٹ

پارٹی کے سکریٹری یا صدر ہیں۔انہوں نے مائک پر کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں دو تقریریں سنی ہیں جن سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں، ایک مسٹر R.Dass کی تقریر،اور ایک آج مولانا صاحب کی۔اور میں صاف کہتا ہوں کہ محمدؐ صاحب (انہوں نے صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی جو انہوں نے بار بار سنا تھا،لیکن وہ ادا نہ کرسکے) خدا کے سچے پیغمبر ہیں،مولانا صاحب آپ صرف مسلمانوں ہی کے نہیں ہیں، ہم بھی آپ پر اپنا حق سمجھتے ہیں، ہم آپ کو آئندہ بھی یہاں آنے کی زحمت دیں گے۔''

یہ سلسلہ بڑا ہی مفید تھا اور اس کے معاشرہ پر بڑے اچھے اثرات مرتب ہو رہے تھے، لیکن مخلوط اجتماعات سے خطاب بڑا نازک اور دشوار کام تھا،اور اس میں ذرا سی بے احتیاطی ''وحدت ادیان'' تک لے جاسکتی تھی،اس لیے زیادہ تر ان اجتماعات سے حضرت مولاناؒ ہی خطاب فرماتے تھے،اور کبھی کبھی مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا خطاب ہوتا تھا،ان دو حضرات کے علاوہ اس نزاکت کو محسوس کرنا اور توازن باقی رکھنا دوسرے کے لیے مشکل تھا۔حضرت مولانا کے بیرونی ممالک کے اسفار اتنی کثرت سے ہو رہے تھے اور اس میں اتنا وقت صرف ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رکھنا بہت مشکل ہونے لگا،اس کے علاوہ بعض غلط فہمیاں بھی پیدا ہونے لگیں اور بعض ایسے اندیشے سامنے آئے جس کی وجہ سے کئی سال جاری رہنے کے بعد یہ سلسلہ موقوف کرنا پڑا،اور سالوں کے بعد ۱۹۷۴ء میں ''پیام انسانیت'' کے نام سے پھر باقاعدہ یہ تحریک شروع کی گئی۔

مخلوط اجتماعات کی تقریریں بڑی مفید تھیں، اس کے دو مجموعے پیام انسانیت اور مقام انسانیت کے ناموں سے شائع ہوئے اور بہت سی تقریریں مختلف رسائل میں منتشر تھیں،اس کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی کہ یہ تقریریں یکجا کرلی جائیں اور ترتیب دے کر شائع کردی جائیں تاکہ عمومی طور پر ان سے فائدہ اٹھایا جاسکے،مسرت کا مقام ہے کہ یہ کام انجام پایا۔

عزیز القدر مولوی عبد الہادی ندوی سلمہ خصوصی طور پر دعا وشکریہ کے مستحق ہیں کہ

انہوں نے حضرت مولاناؒ کے مضامین اور خطابات کو جمع کرنے اور مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، اب تک الحمدللہ سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں، یہ آٹھویں کتاب ہے جس کا موضوع تحریک پیام انسانیت کے قیام سے پہلے کی وہ تقریریں ہیں جو مخلوط اجتماعات میں کی گئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس کے نفع کو عام فرمائے اور اس کی اشاعت کی فکر کرنے والوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی
دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

خرابی کی جڑ یہ ہے کہ برائی اور پاپ کی خواہش پیدا ہوگئی ہے

تاریخ کا مطالعہ

دوستو اور بھائیو! آپ میں اکثر لوگوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہوگا، انسان آج نئے نہیں ہیں، وہ ہزاروں برس سے آباد ہیں، ان کی سیکڑوں برس کی تاریخ محفوظ ہے، اس تاریخ کی سطح پانی کی سطح کی طرح برابر نہیں، اس میں سخت نشیب و فراز ہے، اس میں آدمی کہیں اونچا نظر آتا ہے کہیں نیچا، کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسان کی تاریخ نہیں، خونخواروں اور درندوں کی تاریخ ہے، سب کی تاریخ ہے، مگر انسان کی تاریخ نہیں، اس کے مطالعہ سے انسانوں کا سر جھک جاتا ہے کہ ہم میں ایسے افراد بھی گزرے ہیں، یہ فیصلہ تو آنے والی نسلیں کریں گی کہ ہم اور آپ کیسے آدمی تھے، لیکن یہ اندازہ ہم کر سکتے ہیں کہ انسانوں کا پچھلا ریکارڈ کیسا ہے؟ اس میں بعض ایسے دور نظر آتے ہیں کہ اگر بس چلے تو تاریخ سے ہم ان اوراق کو نکال دیں، ایسا ریکارڈ ہے کہ ہم بچوں کے ہاتھوں میں دینے کو تیار نہیں، مجھے اس کی کہانی سنانی نہیں، لیکن مجھے ایک حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ تاریخ میں جو ایسے ناگوار دور گزرے ہیں، اس میں خرابی کی جڑ کیا ہے؟

جب تک سوسائٹی میں برائی کا رجحان اور بگاڑ کی صلاحیت نہ ہو کوئی اس کو بگاڑ نہیں سکتا

حضرات! عام طور پر لوگ کسی خاص طبقہ یا چند افراد اور بعض اوقات تنہا کسی فرد کو پوری سوسائٹی کی خرابی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان خراب عناصر نے یا اس بگڑے ہوئے فرد نے پوری زندگی کو غلط رخ پر ڈال دیا تھا، لیکن مجھے اس سے اتفاق

نہیں، میں تاریخ کے مطالعہ کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ ایک مچھلی تالاب کو گندہ کر سکتی ہے، لیکن ایک فرد سوسائٹی کو بگاڑ نہیں سکتا، واقعہ یہ ہے کہ اچھی سوسائٹی میں برے آدمی کا گزر نہیں ہو سکتا، وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گا، جس طرح مچھلی کو پانی سے نکال دیا جاتا ہے تو وہ گھٹ کر مر جاتی ہے، اسی طرح جو سوسائٹی برائی کی ہمت افزائی نہیں کرتی، وہ اسے خوش آمدید (Welcome) کرنے کے لیے تیار نہیں، اس میں برائی تڑپنے لگے گی، اس کا دم گھٹنے لگے گا، اور وہ دم توڑ دے گی۔

ہر زمانے میں اچھے برے انسان ہوئے ہیں، لیکن سب برائیوں کا ان کو ذمہ دار ٹھہرانا اور تمام برائیوں کو ان کے سر تھوپ دینا ٹھیک نہیں، اگر کچھ برے لوگ حاوی ہو گئے تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ پوری زندگی کا ہینڈل ان کے ہاتھ میں تھا، وہ جس طرف چاہتے تھے زندگی کو موڑ دیتے تھے، بلکہ بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں سوسائٹی میں خود خرابی آ گئی تھی، اس زمانہ کا ضمیر (Conscience) گندہ ہو گیا تھا، اس میں برائیوں کا رجحان پیدا ہو گیا تھا، اس کے اندر اندھیر ظلم اور خواہشات کو پورا کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہو گئی تھی، وہ خود غرض اور نفس پرست بن گیا تھا، جس دل کو گھن لگ جائے، جو من پاپی ہو جائے، آپ اسے جراثیم سے کسی طرح روک نہیں سکتے، آپ اس کو بیڑیوں میں جکڑ کر کے بھی رکھیں گے تب بھی ان چیزوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

خود غرض انسان

ہر زمانے میں کچھ ایسے افراد رہے ہیں، جن کا عقیدہ تھا کہ بس ہم اور ہمارے اہل و عیال انسان ہیں، اور باقی سب ہمارے خادم ہیں، کچھ ایسے انسان بھی ہیں، جو کروڑوں انسانوں کو بستا دیکھتے ہیں، لیکن وہ خود اپنے ہی محدود حلقہ کو انسان سمجھتے ہیں، یہ لوگ بس یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں بس انھیں کے کنبہ کے دس گیارہ یا بیس پچیس انسان بستے ہیں، ایسے

انسان ہمیشہ رہے ہیں جو اپنے اپنے مسائل اور متعلقین کو دیکھنے کے لیے خوردبین رکھتے ہیں، اور دوسروں کو دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں بھی بند ہوتی ہیں، بعض لوگ دو عینکیں رکھتے ہیں، ایک سے اپنے کو دیکھتے ہیں، دوسری سے تمام دنیا کو دیکھتے ہیں، انھیں نظر بھی نہیں آتا کہ انسان کہاں ہیں، میرا اندازہ ہے کہ ان کے پاس وہ عینک ہے کہ اس کے ذریعہ ان کو اپنے بچے آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں، ان کو اپنی رائی پربت اور دوسروں کا پہاڑ ذرہ نظر آتا ہے۔

اصلاح اور سدھار کی مختلف تجاویز اور تجربے

دنیا کے مختلف انسانوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق زندگی کے سدھار کے طریقے سوچے اور ان پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

کسی نے کہا کہ ساری خرابی کی جڑ یہ ہے کہ انسانوں کو پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا، یہی زندگی کا سب سے بڑا روگ ہے، انھوں نے اسی مسئلہ کو اپنا مشن بنالیا، اس کے نتیجہ میں پاپ اور بڑھا، پہلے لوگ کمزور تھے، پاپ بھی اسی لحاظ سے کمزور تھا، انھوں نے جب خون کے انجکشن دیے اور قوتِ حیات (Vitality) بڑھائی تو ان کے پاپ بھی طاقتور ہوگئے، دل بدلا نہیں، ضمیر بدلا نہیں، ذہن بدلا نہیں، طاقت بڑھ گئی، بے فکری پیدا ہوگئی، فرق اتنا ہوا کہ پہلے پھٹے کپڑوں میں پاپ ہوتے تھے، اب زرق برق لباسوں میں پاپ ہونے لگے، پہلے بے زور اور بے ہنر ہاتھوں سے گناہ ہوتے تھے، اب طاقتور اور ہنرمند ہاتھوں سے وہی سب گناہ ہونے لگے۔

کسی نے کہا: تعلیم کا انتظام کیا جائے، جہالت، ناخواندگی ہی فساد کی جڑ ہے، اور تمام خرابیوں کی اصل وجہ ہے، علم بڑھا، لوگوں نے معلومات حاصل کیے اور نئی نئی زبانیں سیکھیں، لیکن جن کا ضمیر فاسد اور ذہن ٹیڑھا تھا، اور دل کے اندر پاپ بسا ہوا تھا، انھوں نے علم کو فساد اور تخریب کا ذریعہ بنالیا، کھلی بات ہے کہ اگر چور کو لوہاری کا فن آجائے تو وہ

تجوری توڑنا سیکھے گا، اب اگر کسی میں خدا کا خوف اور انسانی ہمدردی کا رجحان نہیں ہے، اور ظلم وستم اس کے خمیر میں پڑا ہوا ہے، تو علم اس کے ہاتھ میں ظلم اور فتنہ وفساد کا آلہ دے دے گا، اور اس کو گناہ اور چوری کے نئے نئے ڈھنگ سکھائے گا۔

بعض لوگوں نے تنظیم کو اصلاح کا ذریعہ سمجھا اور اپنی ساری قوتیں لوگوں کی تنظیم پر صرف کیں، نتیجہ یہ ہوا کہ بگڑے ہوئے افراد کا ایک بگڑا ہوا مجموعہ تیار ہو گیا، جو کام اب تک غیر منظّم طریقے پر ہوتے تھے، اب منظّم طریقہ پر ہونے لگے، اب سازش اور تنظیم کے ساتھ منظّم چوریاں ہونے لگیں، لوگوں نے اخلاقی تربیت، دل اور ضمیر کی اصلاح کی طرف تو توجہ کی نہیں، جیسے بُرے بھلے لوگ تھے ان کو منظّم کرنے ہی کو کام سمجھا، نتیجہ یہ ہوا کہ بداخلاقی کو نئی طاقت حاصل ہو گئی، میں تو کہوں گا کہ ڈاکوؤں اور چوروں اور بداخلاقوں کی تنظیم نہ ہوتی تو اچھا تھا۔

کسی نے کہا کہ زبانوں کا اختلاف اور کثرت فتنہ وفساد کی جڑ ہے، زبان ایک اور مشترک ہونی چاہیے، اسی میں ملک کی ترقی، قوم کی خوشحالی اور انسانیت کی خدمت ہے، لیکن اگر لوگ نہ بدلیں، خیالات نہ بدلیں، دلوں کی خواہشات اور اندر کے رجحانات نہ بدلیں، تو زبان کے بدل جانے یا بولی کے ایک ہو جانے سے کیا خاص فائدہ ہو گا؟ فرض کیجیے کہ اگر ساری دنیا کے چور اور جرائم پیشہ ایک بولی بولنے لگیں، اور ایک ہی زبان اختیار کر لیں تو اس سے دنیا کو کیا فائدہ ہو گا؟ اور اس سے چوری اور جرائم کا کیا سدّ باب ہو گا؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس سے بجائے اس کے کہ چوری اور جرائم کم ہوں، زیادہ ہوں گے اور مجرم کی شناخت میں اور دقّت ہو گی۔

کسی نے کہا کہ وقت کا سب سے بڑا کام اور انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ کلچر ایک ہو جائے، مگر کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہاں تہذیبیں نہیں ٹکراتیں، ہوس ٹکراتی ہے، 'ہم چو ما دیگرے نیست' کا مہلک جذبہ ٹکراتا ہے، ہمارے بہت سے رہنما بے سوچے سمجھے کہنے لگے ہیں کہ اگر تمام دنیا کا کلچر ایک ہو جائے تو انسانیت کی ناؤ پار لگ

جائے گی، اگر پورے ملک کا کلچر ایک ہوجائے تو اس ملک کے رہنے والے شیر وشکر ہوجائیں گے، لیکن دوستو! کلچر کا ایک ہونا مفید نہیں، دل کا ایک ہونا مفید ہے، کہنے والے نے غلط نہیں کہا کہ:

یک دلی از یک زبانی بہتر است

اگر لوگ ایک دل نہ ہوئے تو ایک زبان یا ایک تہذیب ہونے سے کچھ فائدہ نہیں، جو لوگ پہلے سے ایک زبان ہیں، اور جن کی تہذیب اور کلچر مشترک ہے، انھیں میں کونسی محبت اور اتحاد ہے؟ کیا وہ ایک دوسرے پر ظلم نہیں کرتے؟ کیا وہ ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دیتے؟ کیا ان میں سے ایک دوسرے سے عاجز اور پریشان نہیں ہیں؟ کیا ایک کلچر، ایک زبان اور ایک تہذیب کے لوگ آپس میں نہیں لڑتے؟

بعضوں نے کہا کہ لباس ایک ہو، لیکن جب کسی زبردست کو گریباں پکڑنے کی عادت پڑ جائے، اور جیب کترنے کی لت لگ جائے، تو کیا وہ لباس کا احترام کرے گا؟ کیا وہ محض اس وجہ سے اپنے ارادہ سے باز رہے گا کہ اسی کا جیسا لباس دوسرے کے جسم پر ہے؟ انسانیت کا احترام دل میں نہ ہو تو لباس کا احترام کیسے پیدا ہوگا؟ لباس کی قدر و قیمت تو انسان کی وجہ سے ہے۔

دل کی تبدیلی کے بغیر زندگی تبدیل نہیں ہوسکتی

دوستو! انسانیت کے مسائل اور مشکلات کا حل نہ لباس کی یکسانی ہے، نہ زبان اور تہذیب کا اشتراک، نہ ملک و وطن کی وحدت، نہ علم و دولت، نہ تہذیب و تنظیم، نہ وسائل و ذرائع کی کثرت، ان سب میں کوئی ایک بھی ایسی طاقت نہیں جو دنیا کو بدل دے، جب تک دل کی دنیا نہیں بدلتی باہر کی دنیا نہیں بدل سکتی، پوری دنیا کی باگ ڈور دل کے ہاتھ ہے، زندگی کا سارا بگاڑ دل کے بگاڑ سے شروع ہوا ہے، لوگ کہتے ہیں مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے، میں کہتا ہوں انسان دل کی طرف سے سڑتا ہے، یہاں سے بگاڑ

شروع ہوتا ہے، اور ساری زندگی میں پھیل جاتا ہے۔

پیغمبر انسانیت کا مزاج بدلتے ہیں

پیغمبر یہیں سے اپنا کام شروع کرتے ہیں، وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ سب دل کا قصور ہے، انسان کا دل بگڑ گیا ہے، اس کے اندر چوری، ظلم، دغابازی کا جذبہ، اور ہوس پیدا ہوگئی ہے، اس کے اندر خواہش کا عفریت ہے، جو ہر وقت اس کو نچا رہا ہے، اور وہ بچے کی طرح اس کے اشاروں پر حرکت کررہا ہے، پیغمبر کہتے ہیں کہ ساری خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ انسان پاپی ہوگیا ہے، اس کے اندر برائی کا جذبہ اور اس کا زبردست میلان پیدا ہوگیا ہے، اس لیے سب سے ضروری اور مقدم کام یہ ہے کہ اس کے دل کی اصلاح کی جائے اور اس کے من کو مانجھا جائے۔

وہ لوگوں کو فاقہ کرتے دیکھتے ہیں، اس منظر سے ان کا دل جس قدر دکھتا ہے، دنیا میں کسی کا نہیں دکھتا، ان کو کھانا پینا دشوار ہوجاتا ہے، مگر وہ حقیقت پسند ہوتے ہیں، وہ یہ نہیں کرتے کہ اسی کو مسئلہ بنا کر اس کے پیچھے پڑ جائیں، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ خرابی کا نتیجہ ہے، خرابی کی جڑ نہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر لوگوں کے پیٹ بھرنے کا سامان کردیا جائے اور زائد غلہ لے کر بھوکوں کو دیدیا جائے تو یہ ایک وقتی اور سطحی انتظام ہوگا، وہ ایسی فضا اور ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ لوگوں سے دوسروں کی بھوک نہ دیکھی جاسکے، اور خود اپنے گھر سے غلہ لاکر لوگوں کے پاس ڈال جائیں۔

اس کے برخلاف لوگ ایسے حالات پیدا کرتے جاتے ہیں کہ غلہ کھسکتا اور ایک جگہ جمع ہوتا چلا جائے، یاد رکھیے کہ اگر ذہنیت میں تبدیلی نہیں ہوئی، اور غلہ کی تقسیم یا رسد کا انتظام کردیا گیا، تو اس کے بعد بھی لوگوں کو ایسا فن معلوم ہے کہ دوسروں کی جھولی کے دانے ان کی جھولی میں آجائیں، اور دولت ہر طرف سے سمٹ کر ان کے قدموں سے لگ جائے،

آپ نے شاید الف لیلہ کا قصہ پڑھا ہو کہ سند باد جہازی اپنے ایک سفر میں ایک مقام پر پہنچا، اس نے دیکھا کہ جہاز کا کپتان بہت فکر مند اور غمگین ہے، سند باد نے سبب پوچھا تو جہاز کے ناخدا نے بتلایا کہ ہم غلطی سے ایک ایسے مقام پر آ گئے ہیں، جہاں سے قریب مقناطیس کا ایک پہاڑ ہے، ابھی تھوڑی دیر میں ہمارا جہاز اس کے قریب پہنچ جائے گا، مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، جب وہ پہاڑ کشش کرے گا تو جہاز کی سب کیلیں اور تختوں کے قبضے نکل کر پہاڑ سے جا ملیں گے، اور جہاز کا بند بند جدا ہو جائے گا، اس وقت ہمارا جہاز ڈوبنے سے نہ بچ سکے گا، چنانچہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا، مقناطیس نے لوہے کو کھینچنا شروع کیا اور جہاز میں جتنا بھی لوہے کا سامان تھا سب کھنچ کھنچ کر پہاڑ پر پہنچ گیا اور دیکھتے دیکھتے جہاز غرق ہو گیا، خوش قسمت سند باد ایک بہتے ہوئے تختہ کے سہارے کسی جزیرے میں پہنچ گیا اور اس کی جان بچی۔

یہ قصہ غلط ہو یا صحیح، اس سے مجھے کچھ سروکار نہیں، مگر مجھے آپ کو یہ سنانا تھا کہ ہماری سوسائٹی میں بھی مقناطیس صفت سرمایہ دار اور تاجر موجود ہیں، انھیں آپ بھی (Magnet) کہتے ہیں، وہ ایسی سازش کرتے ہیں کہ دولت سمٹ کر ان کے گھر میں آ جاتی ہے، وہ ایسا معاشی جال پھیلاتے ہیں کہ لوگ چار و ناچار سب کچھ ان کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں، اور اپنے وسائل زندگی اور ضروریات ان کے سپرد کر کے پھر غربت اور فاقہ کشی کی زندگی گزارنے لگتے ہیں، پیغمبر قلب کی ماہیت بدل دیتے ہیں، وہ انسان کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کرتے ہیں کہ وہ دوسرے انسان کی فاقہ کشی کو دیکھ نہ سکے، وہ اس کے اندر ایثار کی روح اور قربانی کا جذبہ، اور سچی انسانی ہمدردی پیدا کرتے ہیں، اس کو دوسروں کی زندگی اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہو جاتی ہے، وہ اپنی جان کھو کر دوسروں کی زندگی بچانا چاہتا ہے، وہ اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر دوسروں کا پیٹ بھرنا چاہتا ہے، وہ خطروں میں اپنے کو ڈال کر دوسروں کو خطروں سے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔

ایثار کے دو واقعے

آپ میرے ان لفظوں پر تعجب نہ کریں، یہ سب تاریخ کے واقعات ہیں، ہماری آپ کی اسی دنیا میں ایسا ہو چکا ہے، تاریخ میں ایسے واقعات گزرے ہیں، جو ان فرضی قصوں اور افسانوں سے کہیں زیادہ حیرت انگیز اور تعجب خیز ہیں، جو آج فلموں میں اور اسکرین پر دکھلائے جاتے ہیں۔

محمد رسول اللہ (ﷺ) کی دنیا میں آمد کے کچھ عرصہ بعد کا قصہ ہے کہ ایک مسلمان اپنے ایک زخمی بھائی کی تلاش میں پانی لے کر نکلے کہ شاید پانی کی ضرورت ہو تو میں ان کی خدمت کروں، زخمیوں میں ان کو اپنے بھائی نظر آ گئے جو زخموں سے نڈھال اور پیاس سے بے قرار تھے، انھوں نے پیالہ بھر کر پیش کیا تو زخمی بھائی نے ایک دوسرے زخمی کی طرف اشارہ کیا کہ پہلے ان کو پلاؤ، اگر واقعہ یہیں ختم ہو جاتا تب بھی انسانیت کی بلندی کے لیے کافی تھا، اور تاریخ کا ایک یادگار واقعہ ہوتا، لیکن واقعہ یہیں ختم نہیں ہوتا، جب اس زخمی کے سامنے پیالہ پیش کیا گیا تو اس نے تیسرے زخمی کی طرف اشارہ کیا، اس طرح ہر زخمی اپنے پاس والے زخمی کی طرف اشارہ کرتا رہا یہاں تک کہ پیالہ چکر کاٹ کر پہلے زخمی کی طرف پہنچا تو وہ دم توڑ چکا تھا، دوسرے کے پاس پہنچا تو وہ بھی رخصت ہو چکا تھا، اسی طرح سے یکے بعد دیگرے یہ سب زخمی دنیا سے چلے گئے لیکن تاریخ پر اپنا ایک نقش چھوڑ گئے، آج جب کہ بھائی بھائی کا پیٹ کاٹ رہا ہے، اور ایک انسان دوسرے انسان کے منھ سے روٹی کا ٹکڑا چھین رہا ہے، یہ واقعہ روشنی کا ایک مینار ہے۔

ایک دفعہ محمد رسول اللہ (ﷺ) کے پاس کچھ مہمان آئے، آپ کے یہاں کچھ کھانے کو نہیں تھا، آپ نے فرمایا: ان کو کون اپنے گھر لے جائے گا؟ ایک صحابی حضرت ابو طلحہ انصاریؓ نے اپنے کو پیش کیا، اور مہمانوں کو لے گئے، گھر میں کھانا کم تھا، گھر میں یہ مشورہ ہوا کہ بچوں کو سلا دیا جائے گا اور کھانا مہمانوں کے سامنے رکھ کر چراغ بجھا دیا جائے

گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، مہمانوں نے شکم سیر ہوکر کھایا اور ابوطلحہ بھوکے اٹھ گئے، مہمانوں کو اندھیرے میں پتہ چلنے نہیں پایا کہ ان کا میزبان کھانے میں شریک نہیں ہے، اور وہ خالی ہاتھ منھ تک لے جاتے رہے ہیں۔

انسانیت کا درخت اندر سے سرسبز ہوگا

پس پیغمبر انسان کے اندر تبدیلی پیدا کرتے ہیں، وہ نظام بدلنے کی اتنی کوشش نہیں کرتے، جتنا مزاج بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، نظام ہمیشہ مزاج کا تابع رہا ہے، اگر دل نہیں بدلتا، مزاج نہیں بدلتا، تو کچھ نہیں بدلتا، لوگ کہتے ہیں کہ دنیا خراب ہے، زمانہ خراب ہے، میں کہتا ہوں یہ کچھ نہیں بلکہ انسان خراب ہے، کیا زمین کی حالت میں فرق پڑ گیا؟ کیا ہوا کا اثر بدل گیا؟ کیا سورج نے گرمی اور روشنی دینی چھوڑ دی؟ کیا آسمان کی حالت تبدیل ہوگئی؟ کس کی فطرت (Nature) میں فرق پڑا؟ زمین اسی طرح سونا اگل رہی ہے، اس کے سینہ سے اسی طرح اناج کا ذخیرہ ابل رہا ہے، پھلوں کے ڈھیر نکل رہے ہیں، لیکن تقسیم کرنے والے پاپی ہوگئے، یہ ظالم جب اپنی ضروریات کی فہرست بناتے ہیں تو اخبارات کے صفحات اس کے لیے تنگ اور دفتر کے دفتر ان کے لیے کم، اور جب دوسروں کی ضروریات پر سوچتے ہیں تو ساری علم معاشیات (Economics) کی قابلیت کا کمال اس کے مختصر کرنے میں صرف کر دیتے ہیں، جب تک یہ رجحان نہیں بدلتا انسانیت کراہتی رہے گی، پیغمبر دلوں میں انجکشن لگاتے ہیں، لوگ باہر کی ٹیپ ٹاپ کرتے ہیں، اور اسی پر سارا زور صرف کرتے ہیں، پیغمبر اندر کے گھن کی فکر کرتے ہیں، آج ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے، انسانیت کا درخت اندر سے خشک ہوتا چلا جا رہا ہے، کیڑا اس کے گودے کو کھائے چلا جا رہا ہے، لیکن زمانہ کے بقراط اوپر سے پانی چھڑکوا رہے ہیں، درخت کے اندر سرسبزی اور اس کے نشو ونما کی جو قوت تھی، وہ ختم ہو چلی ہے، لیکن پتیوں کو سرسبز کرنے کو ہوائیں (Gases) پہنچائی جا رہی ہیں، پانی چھڑکا جا رہا ہے، کہ خشک پتے ہرے ہوں، پیغمبروں نے انسان کو انسان بنانے کی کوشش کی، انھوں نے اسے ایمانی انجکشن دیا، اور کہا

کہ اے بھولے ہوئے انسان! اپنے پیدا کرنے والے کو پہچان، اور سوتے جاگتے، چلتے پھرتے اسے نگراں مان، "لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ" نہ اس پر اونگھ کا غلبہ ہوتا ہے، نہ اسے نیند آتی ہے۔

انسانیت کے صحیح نمائندے

بس جب تک انسان کے قلب وجگر سے محبت کا چشمہ نہ ابلے، جب تک دل کے اندر ایثار کا جذبہ نہ پیدا ہو، انسانیت کی اصلاح ناممکن ہے، بس وہ ایسی انسانی تربیت کرتے ہیں کہ اس میں بھائی کے لیے ایثار اور تکلیف اٹھانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، وہ محض قانون سے دنیا کا علاج نہیں کرتے بلکہ وہ انسان کے اندر حقیقی انسانیت، انسانیت کا جوہر پیدا کرتے ہیں، وہ ایسی قوم پیدا کرتے ہیں جو صحیح انسانیت کا مظاہرہ (Demonstration) کر کے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ ہم معدہ، پیٹ اور سر کے غلام نہیں، وہ زبان حال سے اعلان کرتی ہے کہ وہ شکم پرست، شوق پرست، دولت پرست، بادشاہ پرست، یا اہل وعیال پرست نہیں، جب تک ایسی قوم سامنے نہیں آتی، انسانیت کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

اگر کسی ملک میں ایسی قوم پیدا ہوتی ہے کہ سب کو نفع پہنچائے اور خود کو بھول جائے تو وہ انسانیت کو سدھار سکتی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بڑے انسانیت کے خیر خواہ گزرے ہیں، لیکن کسی نہ کسی اسٹیج پر آپ یہ پائیں گے کہ انھوں نے بالآخر اپنا انتظام کر لیا، ایسے بے شمار قوم کے سیوک گزرے ہیں، جنھوں نے قومی سدھار کا کام بڑی مشکلات میں شروع کیا، جیلیں کاٹیں، لیکن بالآخر جیل سے نکل کر حکومت کی کرسیوں پر جا بیٹھے، ان کا یہ حق تھا، انھیں مبارک ہو۔

پیغمبروں کی زندگی

لیکن اللہ کے پیغمبر دنیا سے بے داغ چلے گئے، انھوں نے دنیا کے آرام کی خاطر اپنا

عیش تج دیا، انھوں نے سو فی صدی دوسروں کے فائدے میں بے آرام زندگی گزاری، اور ایک فی صدی بھی اپنا فائدہ نہیں اٹھایا، وہ اور ان کے صحابی اور ساتھی جہاں سے گزرے دنیا کو نہال کر دیا، دنیا آج تک ان کے لگائے ہوئے باغ کا پھل کھا رہی ہے، جسے انھوں نے اپنے خون سے سینچا تھا، جو دوسروں کے گھر میں چراغاں کر گئے، لیکن ان کے گھر میں دنیا سے جاتے وقت اندھیرا تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کی ہوئی روشنی جھونپڑوں اور شاہی محلوں میں یکساں جگمگائی، لیکن جاتے ہوئے ان کے گھر کا چراغ مانگے ہوئے تیل سے جل رہا تھا، حالانکہ مدینہ کے سیکڑوں گھروں میں انھیں کا جلایا ہوا چراغ جل رہا تھا، آپ فرماتے تھے: إِنَّا مَعْشَرَ الْأَنْبِيَاءِ لَانُوْرَثُ مَاتَرَكْنَا صَدَقَةٌ، (ہم پیغمبروں کا کوئی وارث نہیں ہوتا ہے، ہم جو کچھ چھوڑیں وہ سب غریبوں کا حق ہے)، اس سے بڑھ کر آپ کا ارشاد تھا کہ جو کوئی مر گیا اور وہ کچھ ترکہ چھوڑ کر گیا، وہ اس کے ورثاء کو مبارک ہو، ہم اس سے ایک پیسہ نہیں لیں گے، لیکن اگر کوئی قرض چھوڑ کر گیا ہے تو وہ میرے ذمہ ہے، اسے میں ادا کروں گا، کیا دنیا کے کسی بادشاہ یا قائد نے یہ نمونہ چھوڑا ہے؟ آپ کی زندگی انسانیت کا شاہکار ہے، آپ دنیا کے سامنے ایسا نمونہ پیش کر گئے جس میں سوائے ایثار و محبت اور دوسروں کے غم میں گھلنے کے کہیں اپنا رتی برابر فائدہ نظر نہیں آتا، آپ عرب کے واحد بادشاہ تھے، دلوں پر ان کی بادشاہی تھی، لیکن دنیا سے دامن بچائے ہوئے بے منت چلے گئے، آپ ہی نہیں بلکہ جو جتنا آپ سے قریب تھا، اتنا ہی وہ خطرے سے قریب اور فائدہ سے دور تھا، اپنے گھر والیوں سے علی الاعلان کہہ دیا کہ اگر دنیا کی بہار اور عیش چاہتی ہو تو ہم تم کو کچھ دے دلا کر اچھی طرح سے تمہارے گھروں کو رخصت کر دیں گے، تم وہاں واپس جاؤ، اور راحت و آرام کی زندگی گزارو اور ہم سے فارغ خطی لے لو، ہمارے ساتھ رہنا ہے تو درد، دکھ، تنگی، ترشی برداشت کرنا ہے، یہی اس گھر کا تحفہ ہے، اور اسی پر اللہ کے ہاں سے انعام ملے گا۔

دوستو! ہم چاہتے ہیں کہ پھر یہی زندگی عام ہو، انسانیت کی بے لوث خدمت اور

بے غرض محبت کا رواج ہو، پھر دوسروں کے نفع کے لیے اپنے نقصان کو ترجیح دی جائے، پھر ایسی قوم پیدا ہو جو خطرہ کے موقع پر پیش پیش اور نفع کے موقع پر دور دور نظر آئے۔

خواہشات کی تسکین سکون کا راستہ نہیں

آج دنیا کی ساری ریاستیں وحکومتیں اس محور پر گھوم رہی ہیں کہ قوموں اور طبقوں کو ہر طرح سے مطمئن کیا جائے اور خواہشات کی تسکین کی جائے، لیکن دانایانِ فرنگ! یہ اصلاح وتسکین کا راستہ نہیں، یہاں ایک فرد کی خواہشات بھی پوری ہونا مشکل ہے، خواہشات کا یہ حال ہے کہ وہ لامتناہی ہیں، اور دنیا کا یہ حال ہے کہ وہ محدود اور مختصر اور کروڑوں انسانوں میں مشترک ہے، واقعات کی دنیا میں آکر دیکھیے تو اس دنیا میں درحقیقت ایک آدمی کی منہ مانگی خواہشات کو بھی پورا کرنے کی گنجائش نہیں، یہاں کسی بو الہوس کی ہوس پوری نہیں ہوسکتی، یہاں نفس کی تسکین کا خواہش مند پکار پکار کہہ رہا ہے:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

آج دنیا کے بڑے بڑے رہنما یہ کہہ رہے ہیں کہ انسانی خواہشات سب جائز اور فطری ہیں، سب کو پورا ہونا چاہیے، اور اسی پر ساری دنیا میں عمل ہو رہا ہے۔

دوستو! یہی بنیادی غلطی ہے، خواہشات کی تسکین اور تکمیل سے انسانیت کی تشفی نہیں ہوسکتی، خواہشات کی تسکین سے خواہشات میں کمی، اور قلب میں سکون پیدا نہیں ہوگا، یہ تو سمندر کا کھاری پانی ہے، جس قدر اس سے پیاس بجھایئے گا، پیاس بھڑکے گی، آج ساری دنیا میں حکومتیں، ادارے اور تہذیبیں اسی فلسفہ کے مطابق کام کر رہی ہیں کہ انسانوں کی صحیح غلط خواہشات کی تسکین کا سامان کیا جائے، قومیں، طبقے، جمہور اور افراد جو کچھ مانگیں ان کو دیا جائے، اس سے سکون پیدا ہوگا، امن قائم ہوگا، لیکن نتیجہ بالکل الٹا ہے، آج ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے، دل کی لگی کسی سے بجھتی نہیں، خواہشات کا ایک الاؤ جل رہا ہے، اور اس

میں ہر قوم ایندھن ڈالتی چلی جارہی ہے، اور اس کو ہوا دے رہی ہے، آج اس کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے ہیں، اور قوموں اور ملکوں کی طرف لپک رہے ہیں، آج ﴿وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (اس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہیں) کا منظر نظر آرہا ہے، لوگ اس آگ کی شکایت کرتے ہیں، مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ آگ کس نے جلائی؟ یہ الاؤ کس نے روشن کیا؟ اس پر تیل کس نے چھڑکا؟ اس میں ایندھن کون ڈال رہا ہے؟ خواہشات کی تکمیل اور تسکین کے راستہ کا یہی انجام اور منزل ہے۔

لطیفہ یہ کہ یہی لوگ جو قوم کی ہر خواہش اور ہر فرمائش کو پورا کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اور اس کے لیے تفریح و تسکین کا سامان بہم پہنچانا ضروری جانتے ہیں، اپنی اولاد کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرتے، اس کی بہت سی غلط اور مضر خواہشات کی روک تھام کرتے ہیں، بچہ اگر آگ سے کھیلنا چاہے تو نہیں کھیلنے دیتے، لیکن وہ ان قوموں کی ہر خواہش اور فرمائش کو پورا کرنے کے لیے تیار ہیں جو وہ کریں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنی رعایا سے اپنی اولاد کی طرح ہمدردی نہیں، یہی لوگ جو قوموں پر حکومت کرتے ہیں، ان کو خوش رکھنے کے لیے اور ان کے افراد سے رائے حاصل کرنے کے لیے ہر غلط اور صحیح خواہش کی تکمیل ضروری سمجھتے ہیں، آج کسی ملک میں کوئی ایسی جماعت نہیں، اور کسی شخص میں یہ اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ تفریحات اور تعیّشات پر تنقید کرے، لہو ولعب کے بڑھتے ہوئے ذوق، تماش بینی، موسیقی، رقاصی اور مصوری کے حد سے بڑھے ہوئے شوق اور انہماک پر اعتراض کرے، آج کوئی ایسی حکومت نہیں جو ان چیزوں پر ضروری پابندیاں عائد کرے، اور قوم اور اہل ملک کی ناراضگی مول لے۔

اللہ کے پیغمبر خواہشات میں اعتدال پیدا کرتے ہیں اور صحیح ذہنیت اور صلاحیت عطا کرتے ہیں

اللہ کے پیغمبروں کا راستہ اس سے بالکل مختلف ہے، انھوں نے جائز اور ناجائز

خواہشات کی تکمیل اور تسکین کے بجائے خواہشات کو لگام دی، انھوں نے خواہشات کے رخ کو موڑا، اور صرف جائز خواہشات کو اس کا مستحق سمجھا کہ ان کی تکمیل کی جائے، انھوں نے زندہ اور بیدار ضمیر پیدا کیا، اس سے زندگی میں اعتدال اور دلوں میں سکون پیدا ہوا، تمہاری درس گاہوں، تمہاری تجربہ گاہوں (Laboratories) تمہاری سائنس نے دنیا کو بہت کچھ دیا، انھوں نے حیرت انگیز ایجادوں کو جنم دیا، لیکن انسانوں کو پاک ضمیر نہیں دیا، تمہارے ان اداروں نے انسان کے ہاتھ کھول دیے، بچوں کو ہتھیار تو دیے، لیکن ان کی تربیت نہیں کی، آج وہ نادان بچے شوخیاں کر رہے ہیں اور آزادانہ ان ہتھیاروں کا استعمال کر رہے ہیں، لیکن:

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اللہ کے پیغمبروں نے خواہشات پر پہرے بٹھائے، خواہشات میں توازن اور اعتدال پیدا کیا، نفسانی خواہشات کے بجائے اللہ کو راضی کرنے کی زبردست خواہش پیدا کی، انسانی ہمدردی اور غمگساری کا جذبہ پیدا کیا، انھوں نے چیزیں ایجاد کر کے نہیں دیں، مگر انھوں نے وہ ذہنیت پیدا کی جس سے خدا کی بنائی ہوئی اور انسان کی تیار کی ہوئی چیزوں کے استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، انھوں نے ضمیر بخشا، یقین بخشا، آج دنیا کے پاس سب کچھ ہے یقین نہیں ہے، آج دنیا کے کارخانے سب کچھ پیدا کر سکتے ہیں، لیکن یقین پیغمبروں کے کارخانہ سے ملتا ہے، آج دنیا خدا سے ڈرنے والوں سے خالی ہے، یقین سے خالی ہے، انسانیت کی بے لوث خدمت کون کرے؟ خدا کا خوف اور اس کی رضا کا یقین اس کے کنبے کی بے لوث خدمت کا جذبہ دیتا ہے، انسانیت کے ایسے خادم ہر نعرہ سے دور، حکومت کے لالچ سے الگ، سیاسی چالوں اور سیاسی جوڑ توڑ سے بیزار، بے لوث خدمت کرتے ہیں، آج ایسے ہی خدمت گاروں کی ضرورت ہے جن کے پاس کچھ نہ ہو، پھر بھی کچھ لینا نہ چاہیں، بلکہ دینا ہی چاہیں۔

ہمارا پیغام اور ہماری صدا

ہم لوگوں میں اس جذبہ کو پیدا کرنا چاہتے اور ان میں ان حقیقتوں کی پیاس پیدا کرنا چاہتے ہیں، زندگی محض کھانے پینے کا نام نہیں، انسان کی زندگی محض مادی یا حیوانی زندگی کا نام نہیں، ہم ایک نیا ذوق لے کر آئے ہیں، آج کی مادی دنیا میں یہ بات نئی ہے، دراصل یہ بات نئی نہیں، دنیا کے سب پیغمبر جو ہر قوم میں آئے، یہی پیغام لائے، اور سب سے زیادہ طاقت اور وضاحت کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری طور پر یہ بات کہی، یہ حقیقت چوراہوں پر کہنے کے لائق ہے، لوگ پیٹ کے گرد چکر لگا رہے ہیں، اصل زندگی دم توڑ رہی ہے، انسانیت کی پونجی لٹ رہی ہے، ہم ایک صدا لگانے آئے ہیں، حق کی صدا، دنیا اس صدا سے نامانوس ہے، مگر ہم دنیا سے مایوس نہیں، انسانوں کے پاس اب بھی ضمیر ہے، یہ ضمیر مردہ نہیں ہوا، اس پر گرد و غبار آ گیا ہے، اگر وہ گرد و غبار جھاڑ دیا جائے اور اس کو آلودگی سے صاف کر دیا جائے تو اب بھی اس کی گنجائش ہے کہ وہ حق کو قبول کر لے اور اس میں ایمانی شعور پیدا ہو۔(۱)

(۱) ۹؍جنوری ۱۹۵۴ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال (لکھنؤ) میں، ایک مخلوط اجتماع میں جس میں شہر کے سربرآوردہ حضرات اور غیر مسلم تعلیم یافتہ اصحاب کی خاصی تعداد شریک تھی، یہ تقریر کی گئی
ماخوذ از ’’پیام انسانیت‘‘ (ص: ۷ تا ۲۶)، مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۷۴ء)۔

آج دنیا پر خود غرضی اور بد اخلاقی کا مانسون چھایا ہوا ہے اسے چادروں سے روکا نہیں جا سکتا

انوکھا جلسہ

دوستو اور بھائیو! زمانہ کی ایک ریت ہے، وہ ایک لکیر سی بن گئی ہے، اس سے ہٹ کر کوئی کچھ کرے یا کہے تو تعجب ہوتا ہے، ہم اس زمانہ کے رواج کے خلاف آپ کے شہر میں آئے اور عام دستور کے خلاف یہ جلسہ کر رہے ہیں، اس کا نہ کوئی صدر ہے، نہ کوئی تحریک، نہ کوئی تجویز، تعارفی تقریر بھی ہمارے دستور کے خلاف ہوئی، ہمارے عزیز دوست نے اپنی محبت سے ہمارے متعلق بہت کچھ کہا، ہمارے منھ پر ہماری تعریف کچھ کھلتی نہیں، یہ واقعہ ہے، ساتھ ہی ہمیں ان کی محبت کا اعتراف ہے، ہم آپ کے پاس حاضر ہوئے، ہمارے ساتھ ہمارے ستر اسی ساتھی اور ہیں، ہم نے کوئی کمال کی بات نہیں کی، خود ہمارے اس ملک میں اور اس کے باہر لوگوں نے تن من دھن سے انسانیت کی خدمت کی ہے، ہمیں انسانیت کے ان محسنوں کی خدمات کو دیکھ کر شرم آتی ہے، جنھوں نے بے نام ونشان رہ کر بغیر کسی انجمن اور کمیٹی کے انسانیت کی ٹھوس خدمت کی، خدا بھلا کرے یورپ کا کہ اب انجمن اور کمیٹی صدر اور تعارف کے بغیر سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی کام کیا جا سکتا ہے، ہم نے کیا کیا، ہم یہاں محض مالک کی توفیق سے آئے اور مالک کی عطا کی ہوئی زبان سے ہم بول رہے ہیں۔

مجھے آپ سے بے تکلف بات کرنی ہے، مجھے یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ یہ میکروفون ہمارے آپ کے درمیان حائل ہو اور اس کا احسان لیا جائے، مگر مجبوری ہے، میں اوپر بیٹھ

گیا ہوں، تا کہ اپنے بھائیوں کو اچھی طرح دیکھ سکوں، ورنہ میں اس وقت جو کہوں گا گھر کی سی بے تکلف بات ہوگی، آپ اسے گھر کی بے تکلف مجلس ہی سمجھئے۔

آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے

حضرات! مجھے آپ سے جس مسئلہ پر کچھ کہنا ہے، وہ ہمارا آپ کا مشترک مسئلہ ہے، مسائل بہت ہیں، ایک ایک مسئلہ کو الگ الگ چھٹکل سوچیں تو بہت دیر لگے گی، اور بات بہت دور پہنچ جائے گی، یہ زندگی کا بڑا دردناک سانحہ ہے کہ یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے، اس کی خرابی کی جڑ کیا ہے، اس پر ہاتھ رکھنا ہے۔

آپ میونسپلٹی کے واٹر ورکس (Water Works) کے نظام سے واقف ہیں، اگر یہاں نلوں سے خراب پانی آنے لگے، جو معدہ کو خراب کرے اور اس میں بیماریوں کے جراثیم ہوں، تو ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے گھر کے نل میں کپڑا باندھ لے، چھان کر پیے یا اُبال کر پیے، لیکن ہوشیاری یہ ہے کہ واٹر ورکس کو صاف اور درست کرنے کی فکر کی جائے، شہر کے منتظم (Administrator) سے درخواست کی جائے کہ وہ اسے درست کرے، ہم اگر کپڑا باندھ کر یا چھان کر پی لیں گے تو بہت سے راستہ چلتے ناواقف پیاسے ہوتے ہیں، منھ لگا دیتے ہیں، ان کی حفاظت کا کیا طریقہ ہے؟ آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ اس میں کون سا طریقہ درست ہے؟

آج انسانیت کا واٹر ورکس خراب ہوگیا ہے، جہاں سے زندگی اُبلتی ہے وہ دہانہ خراب ہوگیا ہے، زندگی کے بجلی گھر (Power House) میں خرابی آ گئی، جہاں سے سارے شہر میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، انسانیت گھلتی پگھلتی جا رہی ہے، چور بازاری، رشوت ستانی، دھوکہ بازی کا دور دورہ ہے، آج کا انسان ان سب گندگیوں میں مبتلا ہے، آج کے فکرمند انسان ان نتائج پر جھنجھلا رہے ہیں، لیکن غصہ کس پر اتارا جائے اور اس کا ذمہ دار کس کو سمجھا جائے؟

اصل مجرم کون ہے؟

آپ تو انسان ہیں، جانور بھی اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ ان کا دشمن کون ہے، کتا بھی مارنے والے ہاتھ پر دوڑتا ہے، ڈھیلے سے نہیں الجھتا، گدھے کی بے وقوفی ضرب المثل ہے، اسے ڈھیلا ماریے تو وہ مارنے والے ہی کے پیچھے غصہ میں دوڑے گا، وہ سمجھتا ہے، خرابی کی جڑ اور مصیبت کا سرچشمہ کہاں ہے، ہم آپ جانوروں سے بھی گئے گزرے، شیشہ کے محل میں رہتے ہیں، چاروں طرف سے ڈھیلے برس رہے ہیں، ایک ہاتھ ہے، جو برسا رہا ہے، ہمیں وہ ہاتھ نظر نہیں آتا، ڈھیلے پر غصہ اتار رہے ہیں، وہ ہاتھ مطمئن ہے کہ نظر سے اوجھل ہے، اور دل کھول کر ڈھیلے برسا رہا ہے، بڑے بڑے لال بجھکڑ ڈھیلوں میں الجھے ہوئے ہیں، انسانیت کے سدھار کے غور و فکر میں عام مفکرین (Thinkers) کا یہی حال ہے، ہر ایک کے سوچنے کا طریقہ (Way of Thinking) ہوتا ہے۔

پیغمبروں کے سوچنے کا طریقہ

ہمارے سوچنے کا طریقہ پیغمبروں کا طریقہ ہے، ہم پورے غور و فکر اور کافی تجربے کے بعد بالکل مطمئن (Convince) ہو گئے ہیں کہ پیغمبر سسکتی ہوئی انسانیت کے مسائل کو جس انداز سے حل کرتے ہیں، وہی صحیح طریقہ ہے، جب اس طرز پر، اس بنیاد پر کام ہوا، انسانیت کے دل کی پھانسیں چن چن کر نکل گئیں، آنکھوں کی سوئیاں خود بخود باہر ہوئیں، ایسی محبت کا زمانہ آیا کہ سب طرف آرام و اطمینان ہو گیا، قرآن کہتا ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا راستہ بتلانے والے آئے، ان کی تعلیمات پر زمانہ کے پردے پڑ گئے، کچھ ہمیں علمی غرور بھی ہو گیا، ہم پڑھ لکھ گئے اس لیے ہمیں ہزار دو ہزار برس پہلے کے طریقۂ کار فرسودہ (Out of Date) معلوم ہوتے ہیں، اور اس طریقہ پر سوچنا ہمارے لیے عار سا بن گیا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ سورج سب سے پرانا ہے، نئی روشنی والے پرانے سورج سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے، ہم نے پیغمبروں کا طریقہ اپنایا، ہم نے انسانیت کے

سدھار کا مسئلہ ان سے سیکھا۔

خودغرضی اور بداخلاقی کا مانسون

وہ بتلاتے ہیں کہ ہر چیز کا ایک مادہ ہوتا ہے، اگر کسی چیز کا سلسلہ کوئی بند کرنا چاہے اور اس کے نتائج سے بچنا چاہے تو اس کو کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا مادہ ہی نہ پیدا ہونے پائے، آپ کو ایک عام فہم مثال دوں، گرمیوں میں سمندر میں ابخرات (Vapours) پیدا ہوتے ہیں، وہ ابخرات اٹھتے ہیں، گرمی سے وہ تحلیل ہوتے ہیں، پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں، اور موسلا دھار بارش بن کر برستے ہیں، ہم مانسون (Monsoon) کو چادر یا شامیانہ سے نہیں روک سکتے، آج دنیا پر بداخلاقی کا مانسون چھایا ہوا ہے، یہ زرگری کا مانسون ہے، یہ خودغرضی کا مانسون ہے، نفس پرستی، ہوس اور عیش پرستی کا مانسون ہے، دل کے سمندر سے خودغرضی کے ابخرات (Vapours) نفس پرستی کا شوق جب حد سے بڑھ جائے گا، عیش پرستی کی گرمی اسے گھلائے گی، تو خودغرضی کا مانسون برسے گا، جو چادروں سے روکا نہیں جاسکتا۔

اس کا علاج

دل کے مانسون کو روکنے کے لیے اللہ کا یقین، مرنے کے بعد اپنے اعمال کی جواب دہی کا یقین، اور جزا و سزا کا یقین ضروری ہے، ایک ایسا شخص جوان بنیادوں کو نہیں مانتا، اپنے پیدا کرنے والے، روزی دینے والے خالق و رازق کو نہیں پہچانتا، وہ دنیا پر اقتدار حاصل کر کے اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائے؟ وہ کمزوروں کا کیوں لحاظ کرے؟ وہ جانتا ہے کہ کوششوں سے اسے ایک موقع (Chance) ملا ہے، وہ کہتا ہے، زندگی کے پورے مزے لے لو، جو لوگ کسی نہ کسی طرح اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے اوپر آگئے، وہ کیوں کسی کی بالادستی مانیں؟ کیوں کسی کے قانون کا احترام کریں؟ اور آج کا عیش کل پر کیوں چھوڑ دیں؟ اگر مجھے بھی معلوم ہو کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں اور لے دے کر

یہی زندگی ہے تو پھر اس دنیا کا عیش کس دن کے لیے اٹھا رکھوں؟ عرب کا ایک نوجوان شاعر بڑا حوصلہ مند (Ambitious) اور صاف گو تھا، وہ کہتا ہے، دو قبروں کے ڈھیر برابر ہیں، اچھا وہ رہا جو خوب عیش کے مزے اڑا کر گیا، اور بڑا نامراد وہ ہے، جو تکلیفیں اٹھاتا رہا، جب مرنے کے بعد دونوں کو خاک ہونا ہے، اور دونوں کا انجام ایک ہے تو میں کیوں اپنی حسرتوں کا خون کروں اور کس لیے ایثار کروں، جتنا زندگی کا لطف اٹھاؤں، (Enjoy) کروں، میرا حق ہے۔

دوستو! ایک پرانے شاعر کا جو خدا اور آخرت کا قائل نہ تھا، فلسفۂ زندگی ہے، آج ہمارے اس ترقی یافتہ دور کا بھی یہی فلسفۂ زندگی ہے، آج کا فلسفہ اور تعلیم بھی یہی ہے کہ کھاؤ پیو اور مست رہو (Eat,Drink And Be Merry)، جب زندگی کا یہ نظریہ بن جائے تو اس سے یہی کردار (Character) تیار ہوگا جو ہم دیکھ رہے ہیں۔

موجودہ حالات قدرتی اور ہماری ذہنیت و تربیت کا نتیجہ ہیں

انبیاء کہتے ہیں کہ جس میں یقین نہ ہو، اس میں خواہشات کا جو مانسون اٹھے گا وہ ضرور برسے گا، آج ساری دنیا پر نفسانی خواہشات کے مانسون منڈلا رہے ہیں، دنیا کے لوگ کیسے عجیب ہیں، سمندر سے ابخرات اٹھے، خاموش رہے، ہندوستان کی طرف بڑھے خاموش رہے، ہمالیہ سے ٹکرائے تو کچھ نہ بولے، اب جب ٹکرا کر برس پڑے، تو کپڑے بھیگنے کا گلہ ہے، آج ساری دنیا کے لال بجھکڑ امریکہ، یورپ اور روس سب اسی طرح کی بولی بولتے ہیں، دل کے بخارات کو پرورش کرتے ہیں، اور جب خواہشات کے مانسون برستے ہیں، تو اس پر غصہ کرتے ہیں، ہوس کے تالابوں کو برابر گراتے رہے، ساری عمر تم خواہشات کی تربیت کرتے رہے، اسی کی تعلیم دیتے رہے، تم نے برابر اسی کا استقبال و احترام کیا جو مال و دولت میں تم سے بڑھا ہوا تھا، تمہارا (Ideal) یہ ہے کہ جو جتنا مالدار ہے اتنا ہی اقبال مند اور قابل تعظیم ہے، تم برابر دولت کی تعریفیں کرتے رہے، تمہارا معیار شرافت مالداری ہے، میں کچھ

عرصہ ہوا، ایک صاحب سے ملنے گیا، وہ بڑی بے التفاتی اور لاپرواہی سے باتیں کرتے رہے، اسی اثناء میں ایک صاحب آئے جن کو میں پہچانتا نہ تھا، وہ سروقد تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے، اور جب تک وہ رہے ہاتھ جوڑ کر باتیں کرتے رہے، جب وہ چلے گئے تو کہنے لگے کہ یہ بتیس روپے فیس والے ڈاکٹر صاحب ہیں، شیخ سعدی نے اپنا واقعہ لکھا ہے کہ وہ ایک دعوت میں معمولی کپڑے پہنے ہوئے چلے گئے، کسی نے ان کی بات نہیں پوچھی، دوسری دفعہ وہ اچھا لباس پہن کر گئے تو کھانے پر ان کو بڑے ادب اور تپاک سے بٹھایا گیا، وہ اپنے کپڑوں پر سالن ڈالتے رہے، جب پوچھا گیا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ تو فرمایا کہ دعوت تو ان کپڑوں کی ہے، انھیں کے طفیل میں کھا رہا ہوں، اس لیے انھیں کی خاطر کر رہا ہوں، میری ہوتی تو میں تو پہلے ہی میلے کپڑوں میں آچکا ہوں۔

آج دنیا میں یہی ہو رہا ہے، آپ نے بچہ کو کب بتلایا کہ اصل شرافت اخلاق اور کردار ہے، اس نے جب سے ہوش سنبھالا آپ کا یہی رویہ دیکھا کہ جو موٹر پر آیا اس کا پر تپاک خیر مقدم کیا گیا، اور جو یکہ پر آیا اس سے بے التفاتی برتی گئی، اس نے اگر معیار شرافت اخلاق اور انسانیت کے بجائے مالداری کو سمجھا تو کیا بیجا کیا؟

اللہ کے پیغمبر اس کے برخلاف تقوی کو، اخلاق کو معیار شرافت بتلاتے ہیں، حضرت عمرؓ سے عرب کے نامی سردار ملنے آئے، ان سے کہا گیا کہ انتظار کریں، اتنے میں غریب حبشی مؤذن حضرت بلالؓ آئے، وہ فوراً اندر بلا لیے گئے، مدینہ کے ایک اور غریب آئے بلا لیے گئے، اور یہ اپنا اپنا کام بارگاہ خلافت سے پورا کر کے واپس چلے، جیسے کہی ہوئی بات تھی، عرب کے سردار بادشاہوں کا سا دماغ رکھتے تھے، انھوں نے اسے بہت محسوس کیا، انھوں نے کہا: خدا کی شان! ہمارے سامنے یہ فقیر وحقیر بلا لیے جائیں اور ہم بیٹھے رہیں، عجب معاملہ ہے! ان میں سے ایک سمجھ دار آدمی بولے: عمرؓ ترازو میں تول تول کر معاملہ کرتے ہیں، اس میں نہ ان غریبوں کا قصور ہے، نہ عمر کا، سب کو اللہ کے نام پر پکارا گیا تھا،

یہ بڑھ گئے تم بیٹھے رہ گئے، تم نے اللہ کے کام کی قدر نہیں کی، وہ آج عمر کے دربار میں تم سے زیادہ قدر والے ہیں، کل خدا کے یہاں بھی تم سے پہلے پوچھے جائیں گے۔

جنگوں کا ذمہ دار کون ہے؟

موجودہ طرز زندگی میں انسانیت کی بڑائی مالداری اور مادی عروج ہے، ہمارا لٹریچر، ہمارا آرٹ اور ہمارا ادب سب یہی تعلیم دیتے ہیں کہ جس کے پاس مادی وسائل زیادہ ہوں، اور جو جتنا زیادہ مالدار ہوا اتنا ہی وہ شریف ہے، دولت مند ہی آدمی ہے، غریب آدمی ہی نہیں، آج دنیا میں سارا فساد اسی طرز فکر اور اسی معیار زندگی کا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص جلد سے جلد مالدار بننا چاہتا ہے، اور اس کے لیے جائز و ناجائز سب طریقے اختیار کرتا ہے، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ عزت دولت ہی سے ہے۔

گذشتہ دونوں جنگیں مال و دولت اور عزت اور وجاہت کی ہوس کا نتیجہ تھیں، میرا ٹرین میں ایک ہندو دوست سے تعارف کرایا گیا، وہ چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ دنیا میں سارا فساد مولویوں اور پنڈتوں کا برپا کیا ہوا ہے، ان کا پیشہ ہی یہ ہے، میں نے عرض کیا کہ جی ہاں، پہلی اور دوسری جنگ مولویوں اور پنڈتوں ہی کی برپا کی ہوئی تھی، اس پر وہ خاموش ہو گئے، میں آپ سے کہتا ہوں کہ دنیا بھر کا خون پینے والے اور خون کی ہولی کھیلنے والے یہودی صفت کارخانہ دار تھے، ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں یہودی کارخانہ داروں کا ہاتھ تھا، ان کے اسلحہ (Ammunitions) کے بڑے بڑے کارخانے تھے، ان کو کھپانے کے لیے ان کو بڑی بڑی منڈیوں کی ضرورت تھی، ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت انھوں نے سازشیں کیں، وارداتیں کیں، اور ملکوں اور قوموں کو لڑا دیا، ایک کارخانہ کو چلانے کے لیے انھوں نے اتنا بڑا فساد برپا کیا کہ جس میں لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں، اور ملک کے ملک تباہ ہو گئے، بس آج قوموں کو ٹکرانے والا جذبہ یہ ہے کہ بس ہماری تجوری بھرے، اور ہمارا بول بالا ہو، اور ہمارا سکہ چلے، ہماری قوم سرفراز ہو، یہ بڑے پیمانہ کی خود غرضیاں سارے فتنہ

وفساد کی جڑ ہیں، تہذیب یا کلچر یا زبان کا اختلاف فساد کا باعث نہیں ہوا، میں پوچھتا ہوں کیا ایک کلچر، ایک تہذیب اور ایک قومیت کے لوگ نہیں لڑے؟ ہمارے یہاں کوروپانڈو لڑے ہیں، جو ایک ہی خاندان کے لوگ تھے، عرب میں قبیلہ سے قبیلہ لڑا ہے، جس کی ایک ہی زبان اور ایک ہی کلچر تھا، افغانستان میں پٹھان پٹھان سے، پاکستان میں مسلمان مسلمان سے اور یہاں ہندوستان میں ہندو ہندو سے لڑتا ہے، اس ٹکراؤ میں نفسانی اغراض کام کررہے ہیں، خودغرضیاں ٹکرارہی ہیں، غرض کا مذہب ٹکرارہا ہے۔

اندر کا لاوا باہر کو پھونک رہا ہے

پیغمبروں کا طریقہ یہ ہے کہ دل کی خرابی دور ہو، باہر جو بگاڑ ہے وہ اندر سے پھوٹ رہا ہے، اندر کا لاوا باہر کو پھونک رہا ہے، ہم سمجھے باہر کی خرابی اندر گھس گئی ہے، اور باہر کی اصلاح میں لگ گئے، جس طرح سارے جسم پر دل کی بیماری کا اثر پڑتا ہے، اسی طرح پورے نظام زندگی پر نیتوں کے فتور اور ذہنیت کی خرابی کا اثر پڑتا ہے، پرانے قصوں میں آتا ہے، کہ ایک بادشاہ سیروشکار میں اپنے ہمراہیوں سے جدا ہوگیا اور اس کو رات ایک بڑھیا کی جھونپڑی میں گزارنا پڑی، بڑھیا نے دودھ دوہا وہ سیروں اترا، بادشاہ نے یہ ماجرا دیکھا تو اس پر ٹیکس لگانے کا ارادہ کیا، دوسرے وقت بکری کا دودھ کم ہوگیا، بادشاہ وہیں بیٹھا تھا، بڑھیا اس کو پہچانتی نہیں تھی، بڑھیا نے بڑے افسوس سے کہا کہ آج بکری کا دودھ کم ہوگیا، شاید بادشاہ کی نیت میں فتور آ گیا۔

انسان اس دنیا کا بادشاہ ہے، اس کی نیت میں فتور آ گیا، اس کا دل بگڑ گیا، اس لیے یہ سب فساد اور خرابی نظر آ رہی ہے، پیغمبر کی نظر بہت گہری ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں دل کا پاپ دھوؤ، دلوں کو مانجھو، دل ٹھیک کرو، دل کا بگاڑ ہی تو ہے کہ (Food Control) ہوا، چور بازاری شروع ہوگئی، اور جب قیمتوں کا کنٹرول (Price Control) ہوا تو سامان مفقود ہوگیا، اور لوگ ضرورت کی چیزوں کو ترسنے لگے، جب تک انسان کا پاپی من درست

نہیں ہوتا، کچھ نہیں ہوتا، کمیونزم (Communism) نے بھی اس حقیقت کو نظر انداز کیا کہ بگاڑ اندر سے شروع ہوتا ہے، وہاں بھی من کی کوئی فکر نہیں کی گئی، مزدور فاقہ مستی کر رہے ہیں، وہ ان کے خون اور پسینہ پر عیش پرستی کر رہے ہیں، ان کی لاشوں پر شاندار عمارتیں تیار کر رہے ہیں، انھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ ہر طرف من مانی ہو رہی ہے۔

نشہ بندی کی کوشش میں امریکہ کی ناکامی

ہماری سوسائٹی پاپی ہوگئی ہے، اس میں ظلم کا رجحان پیدا ہوگیا ہے، صرف شکوہ گلہ سے دنیا کی اصلاح نہیں ہوسکتی، دل صرف خدا کے خوف سے سدھر سکتا ہے، وہ صرف پیغمبروں کے بتلائے ہوئے طریقہ سے درست ہوسکتا ہے، اگر محض علم وادب یا آرٹ اور سائنس سے درست ہوسکتا تو یورپ کا من پاپ سے بالکل پاک ہوتا، امریکہ میں نشہ بندی کا منصوبہ بنایا گیا، اس کے خلاف محاذ جنگ قائم ہوا، امریکہ نے کروڑوں روپے پانی کی طرح بہائے، ایک زبردست مہم (Campaign) چلائی گئی، اور ایڑی چوٹی کا زور شراب بند کرنے پر لگا دیا گیا، اس کے خلاف اتنا زبردست اور وسیع لٹریچر تیار کیا گیا کہ اگر سب اخبارات، اشتہارات اور میگزینوں کو پھیلایا جائے تو کئی میل تک پھیل جائے، لیکن جتنی کوشش کی گئی، امریکہ کی مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کو اس کی اور زیادہ ضد ہوگئی، شراب کا استعمال پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوگیا، آخر حکومت نے عاجز آکر قوم کے ارادہ اور ضد کے مقابلہ میں ہار مان لی اور قانون واپس لے لیا، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خارجی انتظامات اور دماغ کے راستہ سے جو کوششیں کی جاتی ہیں، وہ ناکام رہتی ہیں، اور کوئی بڑا نتیجہ نہیں پیدا کرتیں، امریکہ کی پڑھی لکھی اور مہذب دنیا نے لٹریچر اور ادب کے معقول اور وزنی دلائل کی ذرا پرواہ نہیں کی اور اپنے نفس اور خواہش کا ساتھ دیا۔

ملک کے لیے سب سے بڑا خطرہ

اس ملک میں جو اخلاقی انارکی پھیلی ہوئی ہے، وہ یہاں کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے، افسانے اخلاق سوز باتیں پھیلا رہے ہیں، ہماری نئی نسلوں کو حیا سوز انجکشن دیے جا رہے ہیں، سینما کے پردوں پر پاپ دکھایا جا رہا ہے، آنکھوں سے، کانوں سے دل میں پاپ اتارا جا رہا ہے، اخبار اور رسالے پاپ کی کھلم کھلا تبلیغ کر رہے ہیں، اور اس کا کوئی توڑ نہیں، ہم صفائی سے علی الاعلان کہتے ہیں، ہمیں آزادی ملی اللہ کی بڑی نعمت ہے، لیکن اگر ہم اخلاق پر کنٹرول نہیں رکھ سکتے تو آزادی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔

یورپ اور ہندوستان کا فرق

یورپ میں ہزاروں خرابیاں ہیں، لیکن وہ تھما ہوا ہے، کچھ شک نہیں مغربی زندگی میں بہت سے اخلاقی جرائم اور بد اخلاقیاں پائی جاتی ہیں، لیکن وہ ذرا آراستہ (Refined) قسم کی ہیں، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں با اصول، پابند اور مہذب ہیں، ان میں گھٹیا قسم کی چھوٹی چھوٹی بے ایمانیاں نہیں پائی جاتیں، وہ ذمہ داری کا احساس رکھتے ہیں، اور ان کی شہری اور مجلسی زندگی زیادہ منظّم اور با قاعدہ ہے، میرے ایک دوست نے بتلایا کہ وہ لندن میں برٹش میوزیم میں کچھ علمی کام کر رہے تھے، لائبریری کے ساتھ وہاں ریسٹورنٹ بھی ہوتے ہیں، اور ان میں عموماً (Girls) کام کرتی ہیں، وہ کہتے تھے کہ میرا روزانہ کا معمول تھا کہ جب تھک جاتا تو ہوٹل میں جا کر مچھلی کے کباب کھایا کرتا، اور جتنے پیسے مجھے بتلائے گئے تھے، اتنے روز دے آیا کرتا تھا، ایک دن جب میں پیسے دینے لگا تو وہاں کی منتظمہ نے مجھ سے کہا: اچھا آپ ہی ہیں، جو روزانہ دو پیسے زیادہ دے جایا کرتے ہیں، ہمارا حساب بڑھتا تھا، اور ہم کئی روز سے اس شخص کی تلاش میں تھے، جو زیادہ (Payment) کر جاتا ہے، آپ کو غلطی سے دام زیادہ بتلا دیے گئے، یہ آپ کے پیسے ہیں، جو الگ رکھ لیے گئے ہیں، یورپین لڑکی میں ایمانداری کا وصف خدا پرستی کے جذبے

سے نہیں پیدا ہوا، وہاں چرچ فیل ہو چکا ہے، ایمانی قدریں (Values) ضائع ہوگئیں، تو انھوں نے خالص مادی نفع کے لیے یہ تجارتی اخلاق وضع کر لیے اور ایسا ذہن بنا لیا جو کامیاب تاجر کے لیے ضروری ہے۔

اخلاق کی دو قسمیں

یورپ کے اخلاق میں توازن نہیں، ان کی مثال وہی ہے کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز، افراد کے چھوٹے چھوٹے معاملوں میں وہ بڑی ایمانداری سے کام لیتے ہیں، لیکن جب اپنی قوم کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے تو ایسے ایماندار افراد قوموں کو نگل جاتے ہیں، انفرادی زندگی میں ان کا یہ حال ہے کہ اگر ۹ بجکر ۱۲ منٹ پر آنے کا وعدہ کریں تو ٹھیک اسی وقت پہنچیں، لیکن قومی معاملات میں دوسری قوموں کو دھوکا دینے میں انھیں ذرا تامل نہیں، عربوں کے ساتھ ان کی عہد شکنی ضرب المثل ہے، ہم خود ان کا یہاں تجربہ کر چکے ہیں، ان میں اخلاق خدا پرستی اور آخرت کی جواب دہی کی بنیاد پر نہیں آئے، بلکہ نفع اندوزی اور مصلحت کے لیے انھیں اخلاقی ذہن بنانا پڑا، جب مصلحت کا تقاضا ہو تو بڑے با اخلاق، وعدہ کے پکے، اور جہاں ان کی مصلحت کا تقاضا کچھ اور ہو تو بڑی سے بڑی بد اخلاقی میں ان کو باک نہیں۔

پیغمبروں کے پیدا کیے ہوئے اخلاق

پیغمبروں کی تعلیم سے جو اخلاق بنتے ہیں، وہ مستقل اور مصلحت اندیشی سے پاک ہوتے ہیں، نفع ہو یا نقصان، جان جائے یا رہے، وہ اعلیٰ اخلاق کو نہیں چھوڑتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ایسا ذہن بنا تھا کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز جو اس وقت متمدن دنیا کے سب سے بڑے فرمانروا تھے، ایک رات حکومت کا کام کر رہے تھے، سرکاری چراغ جل رہا تھا، ایک ملنے والے آ گئے، وہ سلام کر کے مزاج پوچھنے لگے، انھوں نے جواب دینے سے پہلے چراغ بجھا دیا، پھر ٹمٹماتا ہوا دیا منگایا، آنے والے نے جب

دریافت کیا تو کہا: وہ بیت المال کا چراغ تھا، تم آپس کی باتیں کرنے لگے، اس لیے میں نے اس کو گل کر دیا کہ اگر اس کی روشنی میں گھریلو باتیں کروں گا تو اللہ کو کیا جواب دوں گا؟ ایسی احتیاط کے نمونے کہیں کریملن (Kremlin) کے حدود میں نظر آ سکتے ہیں؟ یہ اخلاقی قدریں اور روحانی بلندیاں ان کے خیال میں نہیں آ سکتیں، وہ زیادہ سے زیادہ اتنا سوچ سکتے ہیں، اور ان کے خیال کی پرواز یہیں تک محدود ہے کہ ہر انسان کو پیٹ بھر کھانا، دوا، اور رہنے کا مکان ہو، بیگار نہ لو، خواہشات کا احترام کرو، وغیرہ وغیرہ۔

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ جو ایران اور رومن ایمپائر کی دو زبردست شہنشاہیوں کے زبردست فاتح تھے، ان کے زمانے میں قحط پڑا تو اچھی غذا اپنے اوپر حرام کر لی، وہ سرخ و سفید تھے، لیکن تیل کھاتے کھاتے ان کے چہرے کا رنگ سانولا ہو گیا۔

سب سے بڑی وطن دوستی اور ملک کی وفاداری

ہم سیدھی سادی بات یہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے راستہ کی دعوت دینے آئے ہیں، ہم اس بنیاد پر انسانوں کو انسانیت کی دعوت دینے آئے ہیں، ہم اس کو سب سے بڑی وطن دوستی اور ملک کی وفاداری سمجھتے ہیں، ہم سے زیادہ کوئی اس کی خدمت نہیں کر سکتا، ہم مانتے ہیں کہ ملک کے لیے ایسے ادارے ضروری ہیں، جن سے ملک ترقی کرے، ہم ان کی تحقیر نہیں کرتے، ملک کے لیے تعلیمی اداروں، شفاخانوں، صفائی کے محکموں کی ضرورت ہے، ملک کو رسل و رسائل (Communications)، دفاع (Defence) اور دوسرے محکموں کی ضرورت ہے، ان سب کے باوجود ملک میں ظلم، اندھیرا اور دوسرے کے پیٹ کاٹنے کا جو طاعون پھیلتا جا رہا ہے، اسے نہ روکا گیا تو اس کی عزت، اس کا وقار، اس کی آزادی خاک میں مل جائے گی، ہم سب سے کہتے ہیں کہ یہ ملک کی سب سے پہلی ضرورت ہے، وہ تمام ادارے جنھیں میں پہلے ضروری اور مفید کہہ چکا ہوں، سب اس کے بعد آتے ہیں، ہم اس حقیقت کے پرچار کے لیے گھر سے نکلے ہیں، کوئی اور اس کام کو کرتا ہوتا تو اس

کے ساتھ تعاون (Cooperate) کرتے۔

ہماری دعوت

ہم علی الاعلان ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ ہم اس ملک میں حصہ رسد بٹانے نہیں آئے تھے، ہم ان ملکوں کو چھوڑ کر جو خود دولت سے بھرے ہوئے تھے، یہاں کی دولت میں حصہ لگانے نہیں آئے تھے، ہم ایک مشن، ایک خدمت پر آئے تھے، ہم یہاں خدا کے بندوں کو خدا کا بندہ بنانے آئے تھے، یہاں جو مسلمان آئے تھے، وہ اخلاق، محبت، خدا پرستی کا پیغام لے کر آئے تھے، انھوں نے اس ملک کو کچھ دیا، لیا نہیں، وہ یہاں سے کچھ لینے نہیں آئے تھے، اگر ایسا سوچتے تو اٹالہ کی ایسی شاندار و پائدار مسجد نہ بناتے، وہ تو خدا پرستی اور انسان دوستی کی دعوت دیتے تھے، کہاں کے عرب، کہاں کے عجم، یہ سب ہماری بنائی ہوئی خودساختہ حدیں ہیں، ساری دنیا کے پیدا کرنے والے خالق و مالک اور رازق اور ساری دنیا کو بغیر شرکت کے چلانے والے ایک اللہ کی طرف سے وہ یہ تعلیم لائے تھے، انھوں نے دنیا سے لیے بغیر ساری دنیا کی خدمت کی، انھوں نے سچے موتیوں سے انسانیت کی جھولی بھر دی، اور اپنے ہاتھ خالی رکھے، اپنے بچوں کی مطلق فکر نہ کی، اور اپنے کنبے کی طرف سے آنکھیں بند کر کے پیٹ پر پتھر باندھ باندھ کر لوگوں کی سیوا کی، ان کی تکلیفوں کو راحتوں سے بدلا، جو آیا غرباء میں تقسیم کیا، ضرورت مندوں کی جھولیاں بھریں، انھیں خادم اور ملازم دیے اور اپنے بچوں کو بالکل محروم رکھا، ایک دفعہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر لیٹے تھے، جسم پر نشانات پڑ گئے تھے، حضرت عمرؓ نے دیکھا تو کہا: اللہ اکبر! اللہ کے رسول ہو کر اس تکلیف میں رہیں، اور دنیا کا خون چوسنے والے ظالم قالینوں اور مسہریوں پر آرام کریں، آنحضرتؐ نے فرمایا: عمر! عیش تو آخرت کا عیش ہے۔

مسلمانوں کی غلطی

ہم مسلمانوں سے کڑوی بات کہتے ہیں، ہم ان سے کہتے ہیں، تم نے ان باتوں کو

مانا ہے، تمہارا ان پر ایمان ہے، تم ان اخلاق و کردار کو چھوڑ کر جانوروں کی سطح پر آ گئے، تم اپنے کردار اور عمل سے اسلام کو بدنام کرتے ہو، اس کے روشن نام کو بٹہ لگاتے ہو، تم دنیا کو اسلامی زندگی کی جو چلتی پھرتی فلم دکھلا رہے ہو، وہ بڑی افسوس ناک ہے، تم نے جو زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے، اس میں کون سی جاذبیت (Attraction) ہے، پہلے تم جس راہ سے گزر جاتے تھے، نقش چھوڑ جاتے تھے، دیر تک تمہاری خوشبو محسوس ہوتی رہتی تھی، جیسے نسیم کی خوشگواری محسوس ہوتی رہتی ہے، مسلمان جدھر سے گزر گئے گلی کوچے معطر کر گئے، اور جہاں سے چلے آئے وہاں سے سفارتیں بھیجی گئیں کہ ہمارے ملک میں سب کچھ ہے، مسلمان نہیں ہیں جنھیں دیکھ کر لوگ اپنی زندگی درست کریں، اور جو ان کے مقدمات و معاملات میں بے لاگ فیصلہ کریں، ان کی خواہش پر مسلمان بھیجے گئے، افسوس اب تم ایسے بن گئے کہ تمہارے نہ ہونے سے ملک میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، آج تک کسی نے اپنے ملک سے ماہرین فن، ڈاکٹروں اور دستکاروں کو نکالا ہے؟ مشرقی پنجاب میں لوہاروں کی ضرورت تھی تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ بسائے گئے، اگر تم میں اخلاقی برتری (Moral Superiority) ہوتی تو اخلاقی ضرورت کا احساس مجبور کرتا کہ تمہیں ملک کی امانت سمجھ کر رکھا جائے، تمہارے دودھ والے پانی ملانے سے پرہیز کرتے، تمہارے درزی کپڑا بچانے کو عیب سمجھتے، تمہارے دستکار اور مزدور محنت سے پورا دن لگ کر کام کرتے، تمہارے حاکم رشوت کو حرام سمجھتے، تو دنیا کا کوئی ملک تمہاری جدائی کو گوارا نہ کرتا۔

ایک کشتی کے سوار

اپنے وطنی بھائیوں سے بھی مجھے دلی محبت ہے، ہمارا آپ کا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہے، آپ اچھے تو ہم بھی اچھے، آپ کی تکلیف ہماری تکلیف ہے، اللہ کے پیغمبر کسی خاص ملک کو نوازنے نہیں آئے، وہ سارے عالم کے لیے رحمت بن کر آئے "وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ" خدا کے آخری نبی حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے

آ کر عربوں کے قومی غرور کو پاش پاش کر دیا، انھوں نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے نسلی غرور کو توڑ دیا ہے، میں انھیں اپنے قدموں سے روندرہا ہوں، عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ عجمی کو عربی پر، تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے بنے تھے، ہم سب ایک کشتی کے سوار ہیں، کشتی میں ایک اوپر کا درجہ (Storey) ہے، اور ایک نیچے کا، نیچے والے اگر اس میں سوراخ کریں اور اوپر والے ان کا ہاتھ نہ پکڑیں تو کشتی غرق ہو جائے گی، اور نیچے اوپر والے سب ڈوب جائیں گے، آج ہمارے ملک کی زندگی کے نچلے حصہ میں شگاف کیا جارہا ہے، اسے روکنے کی فکر کریں، اس میں پاجامے اور دھوتی کی کوئی تمیز نہیں، کسی کلچر اور تہذیب کی کوئی قید نہیں، سمندر کسی کی رعایت نہیں کرتا، ہمیں اللہ سمجھ دے، سینوں کو روشن کرے، ہم انسانیت کا درد محسوس کریں، اپنے اس پیارے ملک کو جس پر ہمارا حق ہے، جس کو ہم نے اپنے خون پسینہ سے سینچا ہے، ہم پیغمبروں کے راستے سے سنواریں، ہم اس کو ایک نمونہ کا ملک بنادیں، جس میں ایمان، یقین، اخلاق، انسانیت اور ہمدردی وایثار کی فضا ہو، اس کے لیے ایک جری قدم (Bold Step) کی ضرورت ہے، قدم اٹھایئے، ہمت کیجیے، میں نے کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا، آپ اس کا وزن محسوس کریں، یہ بوجھ تنہا ہماری طاقت سے باہر ہے، اس کا پرچار کریں اور سنجیدگی سے اس کے لیے کچھ کرنے کا فیصلہ کریں[1]۔

---

(۱) یہ تقریر ۱۵؍ جنوری ۱۹۵۴ء کو جون پور کے ٹاؤن ہال میں کی گئی، شہر کا تعلیم یافتہ اور چیدہ مجمع تھا، کثیر تعداد میں غیر مسلم اصحاب اور مختلف سیاسی جماعتوں اور انتظامی اداروں کے لوگ موجود تھے۔
ماخوذ از ''پیامِ انسانیت'' (صفحہ ۲۷ تا ۴۸)۔

انسان خود پرست بھی ہے خود فراموش بھی

انسان اور جانور کا فرق

دوستو اور بھائیو! جانوروں اور انسانوں میں ایک بہت بڑا فرق ہے، اور وہ یہ کہ جانوروں میں اپنی حالت سے بے اطمینانی اور اپنی زندگی کی ترقی کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی، لیکن انسان اس کا احساس رکھتا ہے، ہم اور آپ اپنی زندگی سے غیر مطمئن ہیں، اس بے اطمینانی کو عام طور سے برا سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر یہ بے اطمینانی جو انسان کا جوہر ہے، ختم ہو جائے تو پھر زندگی کی خوبی اور دلچسپی ختم ہو جائے، ہر شخص زندگی کی شکایت کرتا ہے، اور اکثر گفتگو اس بے اطمینانی پر ہوتی ہے، مگر اس کو دور کرنے کی فکر اور اس کے اسباب پر غور کرنے کی تکلیف بہت کم لوگ گوارا کرتے ہیں، کیوں کہ یہ ایک ذمہ داری کی چیز ہے، اور انسان ذمہ داری سے گھبراتا ہے۔

اگر مشین یا ایک گھڑی میں خرابی ہو جائے، تو اس کو گرانے اور پٹکنے سے وہ درست نہیں ہوتی، بلکہ اس کو آسانی اور سہولت سے درست کرنے سے ہی کام چلتا ہے، اسی طرح غور کرنا ہے کہ اس وقت انسانیت کی چول تو اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی نہیں ہے، اور یہ سارا بگاڑ اور بے اطمینانی انسانیت کی پستی ہی کا نتیجہ تو نہیں ہے، جس کے ذمہ دار ہم اور آپ ہیں۔

انسان کے لیے سب سے محبوب اپنی ذات ہے

انسان کو سب سے زیادہ اپنی ذات سے محبت ہے، اور جس سے جتنی دلچسپی ہے، وہ

اپنی ذات کے تعلق کی بنا پر، ہر محبت میں انسان کی اپنی ذات چھپی ہوتی ہے، اور اس کو دیکھنے کے لیے ایک خوردبین کی ضرورت ہے، محبت کے فلسفہ پر غور فرمائیے کہ کسی شخص کو آپ سے محبت ہے تو یقیناً آپ کو بھی اس سے محبت ہوگی، اولاد، بھائیوں اور دوستوں کی محبت میں در حقیقت انسان کی اپنی محبت کام کرتی ہے، انسانی محبت کے لیے سائی کالروجیکل خوردبین کی ضرورت ہے، اگر انسان کو اپنی ذات سے محبت نہ ہو تو یہ سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے، اب تو یہ تسلیم کیا جارہا ہے کہ قوت کشش کا فلسفہ بھی دراصل ایک تعلق اور محبت کا رشتہ ہے، جو نظام شمسی کو قائم رکھتا ہے، اس دنیا میں جو رونق و رنگینی اور چہل پہل ہوتی ہے، وہ سب انسان کی اپنی ذات سے دلچسپی رکھنے کا نتیجہ ہے، اگر انسان کو اپنی ذات سے دلچسپی نہ ہو تو بازار، کارخانے اور کاروباری سرگرمیاں سرد پڑ جائیں، کیونکہ ذاتی دلچسپی تو کسی چیز سے نہیں، بلکہ انسان کو اپنی ذات کا عشق دوسری چیزوں سے تعلق اور محبت پر مجبور کرتا ہے، یہ لاکھوں برس کی پرانی اور فطری حقیقت ہے، اس دنیا میں جو کچھ طاقت ہے، زینت اور نظام آپ دیکھتے ہیں، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ انسان اپنی ذات سے دلچسپی رکھتا ہے، انسان اس دنیا کا مرکز ہے، اور ساری چیزیں اس کے گرد گھوم رہی ہیں، اگر انسان اپنی ذات سے دلچسپی نہ رکھے اور اس کو فراموش کردے، اپنی حقیقت سے ناواقف ہو اور اپنی ذات کو بھول جائے، تو بڑی انارکی پھیل جائے اور بڑی ابتری اور بدنظمی رونما ہو۔

ایک ذہنی طاعون

انسان کے لیے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو سمجھے، اپنی حیثیت کو پہچانے، اور یہ جانے کہ یہ ساری دنیا میرے لیے بنائی گئی ہے، اور انسان ہی اس دنیا کی پیدائش کا مقصد ہے، ذریعہ کو ذریعہ اور مقصد کو مقصد سمجھنا چاہیے، انسانی تاریخ کا یہ ایک بحرانی دور اور ذہنی پلیگ ہے کہ وہ اپنی ذات کو فراموش کردے، اپنے مقصود اور وسائل و ذرائع کو الگ الگ نہ پہچانے اور ذرائع کو مقصود سمجھے، انسان پر خود فراموشی کا طاری ہونا ایک خطرناک بیماری ہے، کہ وہ یہ بھلا دے کہ وہ کس مقام پر رکھا

گیا تھا، اور اس کی کیا حیثیت اور ذمہ داری ہے، اسے کون سا پارٹ ادا کرنا ہے، اور اس کا اس عالم سے کیا تعلق ہے۔

اس زمانہ میں ایک خاص قسم کا ذہنی پلیگ پھیلا ہوا ہے، جو مشرق سے مغرب تک ہے، بظاہر تو انسان اپنی ذات سے اس قدر دلچسپی اس زمانہ میں رکھتا ہے، اس کے لیے جو محنتیں اور کوششیں کر رہا ہے، اور جو ایجادات، اختراعات اور مصنوعات سامنے آ رہی ہیں، وہ یہ دھوکا دیتی ہیں کہ انسان کو اپنی ذات سے جس قدر دلچسپی اس زمانہ میں ہے، ایسی دلچسپی کسی زمانہ میں نہیں رہی، انسان پچھلے دور میں گویا سویا ہوا تھا، اب جاگا ہے، زندگی کو جیسا پر تکلف اور راحت آشنا بنا دیا گیا ہے، وہ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ انسان کو اپنی ذات سے اس وقت ہمیشہ سے زیادہ دلچسپی ہے، انسان اپنی ذات کے لیے جو ذہانتیں دکھا رہا ہے، اور جو قوتیں استعمال کر رہا ہے، ایسا تاریخ میں کبھی نہیں ہوا، اور اب بظاہر انسان کو اپنی ذات سے بے انتہا شیفتگی ہے، لباس نئے نئے، کھانے عجیب وغریب اور راحت وسہولت کے کتنے ذرائع نکل آئے ہیں۔

اس زمانہ کی خود فراموشی

میں یہ عرض کروں گا کہ دراصل انسان نے اپنی ذات، اپنی آدمیت، اپنے جوہر، اپنے اصل ذائقہ اور اپنی حقیقی لذت کو جس قدر اس زمانہ میں بھلایا ہے، ایسا کبھی نہیں بھلایا تھا، انسان اس وقت سب سے کم اپنی ذات اور اپنے ذاتی مسائل پر غور کرتا ہے، اور جو چیزیں اس کے لیے پیدا کی گئی تھیں، ان پر اپنی زندگی کو قربان کر رہا ہے، ظاہری چیزیں، جھوٹے تقاضے اور بیرونی لذتیں اس پر ایسی حاوی ہو چکی ہیں کہ وہ اپنے باطن اور اپنی حقیقت کو بالکل فراموش کر چکا ہے۔

یہ دور دراصل دو متضاد پہلو رکھتا ہے، ایک ظاہر اور دوسرا باطن، اگر پرکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ اس مادی ترقی کے دور میں انسان نے اپنے روحانی جوہر اور حقیقی مقصد

اور زندگی کی اصل لذت کو بالکل بھلا دیا ہے، جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، اور لطف یہ کہ اپنے فرض کو نہیں پہچانتا، اپنی بیماری کو سنجیدگی سے نہیں سوچتا، اس کے ذرائع مقاصد بن گئے ہیں، انسان ان چیزوں پر کیسے مر رہا ہے، جو اسی کے لیے ہیں، ذرا غور کیجیے، کیا انسان اپنی ذات سے واقف ہے؟ اپنی زندگی کا جائزہ لیجیے، کیا انسان اپنی حقیقی راحتوں کو یاد کرتا ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ انسان پر ایک جنون طاری ہے، اور وہ ایک عجیب کھیل کھیل رہا ہے، صبح سے شام تک ایک چکر میں رہتا ہے، جانوروں سے زیادہ محنت کرتا ہے، بہت سے انسان ایسے ہیں، جنھوں نے اپنے آپ کو روپیہ ڈھالنے کی مشین سمجھ رکھا ہے۔

لاحاصل کوشش

میرے بچپن میں بچے ایک کھیل کھیلا کرتے تھے کہ بڑھیا! بڑھیا! کیا ڈھونڈ رہی ہے؟ جواب ملتا تھا: سوئی، سوئی کا کیا کرے گی؟ جواب ملتا تھا: تھیلی سیوں گی، تھیلی کا کیا کرے گی؟ جواب ملتا: روپیہ رکھوں گی، روپیہ کا کیا کرے گی؟ جواب ملتا: گائے خریدوں گی، گائے کا کیا کرے گی؟ جواب ملتا: دودھ پیوں گی، اُدھر سے جواب ملتا: دودھ کے بدلے ''موت''۔ آج ساری دنیا یہی کھیل کھیل رہی ہے، ساری دنیا اپنی محنتوں کے صلہ میں جو حاصل کرنا چاہیے تھا، اس کے بجائے بے مقصد اور غیر حقیقی چیزوں میں الجھ کر رہ گئی ہے، انسان تعلیم حاصل کرتا ہے، اور تعلیم اس لیے کہ روپیہ کمائے، اور روپیہ اس لیے کہ آرام پائے، یہ ایک مسلسل زنجیر ہے، جس میں سارے انسان جکڑے ہوئے ہیں، انسان جس کے لیے سب کچھ کرتا ہے، اس کو بھول جاتا ہے، آج حقیقی مقاصد زندگی بالکل فراموش کیے جاچکے ہیں، زندگی کا سارا سفر اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ انسانیت جس کے لیے چلی تھی، وہ اس کا راستہ نہیں۔

سکہ کی انسان پر حکومت

سکہ کس لیے ہے؟ اس کی قیمت یہی تو ہے کہ انسان اس سے کام لے، آپ نے

بے جان سکہ میں جان ڈالی، مگر سکہ کے یہ معنی تو نہیں کہ آپ اس سے عشق کریں، اس سے جو کام لینا چاہیے تھا، وہ نہیں لیا جاتا، بلکہ سکہ اس وقت انسان پر حکومت کررہا ہے، اس سکہ کے لیے دنیا میں دو بڑی لڑائیاں ہوئیں، آپ نے عہدوں، کوٹھیوں اور کرسیوں کو اپنے اوپر حکمراں بنالیا، انسان نے انسان کے خلاف خوفناک ہتھیار استعمال کیے، انسان نے انسانیت سے سرکشی کی، بغاوت کی، جس کے نتیجہ میں انسان کو انسان سے ہزار گنا ادنی چیزوں کو اپنا حکمراں بنانا پڑا، وہ چیزیں جن میں زندگی نہیں، لوچ نہیں، کوئی برتری نہیں، وہ انسان پر مسلط ہیں، یہ ایک عجیب اور عبرتناک حال ہے کہ اشرف المخلوقات پر اس کے بنائے ہوئے قانون اور بے جان اشیاء حکومت کریں۔

ذرائع مقاصد بن گئے

اس دنیا میں اکثر انسان ایسے ہیں جن کو یاد نہیں کہ ان کا مقام اور مقصد حیات کیا ہے؟ جو چیزیں انسان کے مقاصد کا صرف ذریعہ ہیں، ان پر ایسی محنتیں کی جارہی ہیں کہ گویا وہی اصلی مقاصد ہیں، اصلی مقاصد کو بھلا کر انسان ہوس کے جال میں پھنسا ہوا ہے، انسان چاہتا ہے کہ دوسروں پر حکومت کرے، لیکن جب ایک کو دوسرے پر فتح ہوتی ہے تو اس پر دوسری چیزیں حکومت کرتی ہیں، ایک قوم کیا، ایک فرد بھی گوارا نہیں کرتا کہ اس پر دوسرا حکومت کرے، مگر انسان سے ہزار درجہ پست چیزوں کو مثلاً کپڑوں کو، کوٹھیوں کو، روپیہ کو آج ہم نے اپنے اوپر حکمراں بنا رکھا ہے، انسان پر آج خواہشات کی، اپنے بنائے ہوئے قانون کی اور جمادات کی حکومت ہے، حالانکہ ان چیزوں میں ہرگز کوئی جاذبیت نہیں، اور وہ ہرگز ہمارا مقصود بننے کے قابل نہیں، مگر ہم نے جمادات کو ترجیح دی انسانوں پر، ہم نے نباتات کو انسان سے افضل سمجھا، حالانکہ ہم میں آج لاکھوں انسان حقیقی آرام سے محروم ہیں، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان نے انسانیت کو فراموش کردیا، اور اس پر ایک خود فراموشی طاری ہے۔

یقیناً ہم لوگ بھول چکے ہیں کہ ہمارا اصل مقام کیا ہے، ہماری غلط روش ہی سے ساری دنیا میں آج انتشار ہے، آج ہم عہدوں کے لیے جان دیتے ہیں، اور اپنی حقیقی عزت اور اصل راحت کو فراموش کر چکے ہیں، جغرافیہ کس لیے ہے؟ اگر اس دنیا میں انسان نہ پیدا ہوتا تو تاریخ وجغرافیہ کی کیا ضرورت تھی؟ سارے علوم وفنون انسان ہی کے لیے تو ہیں، پھر یہ کیا ہے کہ انسان اپنی پوزیشن نہیں سمجھتا، اور اپنی حقیقت سے دور ہوتا چلا جارہا ہے، آپ کا اس دنیا سے کیا علاقہ ہے؟ ہم کس لیے آئے؟ کیا ہم اس دنیا میں اس لیے بھیجے گئے کہ دریاؤں پر دوڑیں، اور ہوا میں اڑیں، اور مادی ترقیوں کو اپنا مقصد حیات بنالیں؟ ہماری زندگی کا جولباس ہے، اس میں برابر جھول پڑتے جارہے ہیں، اور دامن انسانیت آج تارتار ہے۔ ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

خدا کے برگزیدہ بندے جنھیں پیغمبر کہتے ہیں، دنیا میں اسی لیے آئے کہ انسان کو اس کا مقام اور مقصد زندگی بتلائیں، اور انھوں نے ایک موٹا اصول بتلایا کہ انسان اللہ کے لیے بنایا گیا ہے، اور یہ ساری مخلوق انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے، اگر ہم اور آپ یہ سمجھ لیں کہ ہم اس دنیا کے امین، ٹرسٹی اور نگراں ہیں تو یقیناً ہمارا اور آپ کا رویہ اور طرز زندگی بدل جائے، اور دنیا میں جو فساد اور تباہی برپا ہے، وہ یقیناً دور ہوسکتی ہے۔

دولت مند بننے کی ریس

لیکن اگر آپ یہ سمجھ بیٹھیں کہ آپ صرف روپیہ ڈھالنے کی مشین ہیں، تو انسانیت کے لباس میں جھول پڑتے ہی جائیں گے، غیر محدود تعداد میں روپیہ پیدا کرنا جب آپ کا مقصد حیات ہوگا، تو نہ آپ انسانی رشتہ کو ملحوظ رکھیں گے، نہ کسی کے دل کو ستانے میں عار ہوگا، نہ کسی پر ظلم کرنے میں ہچکچائیں گے، اگر آپ کا آئیڈیل یہ ہوگا کہ زندگی صرف عیش و آرام و دولت مند بننے اور تھوڑی مدت میں جلد از جلد روپیہ سمیٹنے کا نام ہے، پھر اس کا نتیجہ

یہی ہوگا جو آج ہمارے سامنے ہے، خواہ انسانیت کا خون ہو اور آدمیت برباد ہو، مگر انسان دولت مند بننے کی اس ریس میں آگے نکلنے کی کوشش کررہا ہے، ساری اخلاقی تعلیمات طاق پر رکھی ہوتی ہیں، اور ہر ایک شہر میں ایک ریس کا میدان گرم ہے، دفتروں میں شام ہونے سے پہلے کلرک چاہتا ہے کہ جیب بھرے، اس وقت فلسفہ، شاعری اور فائین آرٹس کا مقصد بھی دولت کمانا اور شہرت حاصل کرنا ہے، اور ولایت میں تو روحانیت کا مقصد بھی دولت کمانا اور شہرت حاصل کرنا ہے، اور ولایت میں تو روحانیت کا مقصد بھی یہی بن گیا ہے کہ دولت حاصل ہو۔

سکہ کے اخلاق

آپ جس چیز سے محبت کریں گے، اس کا عکس آپ پر ضرور پڑے گا، آج روپیہ کی محبت کا عکس بھی پوری انسانیت پر پڑ رہا ہے، روپیہ کی بے وفائی اور اس کا تلون آج ہمارے دماغوں اور دلوں میں گھس چکا ہے، سارا دھیان گیان آج اس سکہ کے دھیان میں مٹ چکا ہے، ہم میں سکہ کی خاصیت یعنی سختی، تلون اور بے وفائی پائی جارہی ہے، ساری عمر کی کوشش کے باوجود اور روپیہ زیادہ سے زیادہ کمانے پر بھی آج دنیا کو وہ فائدہ نصیب نہیں ہوتا جو سکہ کا مقصد تھا، کیوں کہ انسانی ہمدردی اور جذبۂ خدمت کے بغیر سکون کی دولت حاصل نہیں ہوسکتی، انسانوں کی حق تلفی انسانیت کا خون ہے، آئیڈیل کی حکومت ہر زمانہ میں رہی، مگر کسی زمانہ میں بھی انسانی زندگی کا یہ آئیڈیل رہا ہے کہ دولت کے حصول کی خاطر انسان کا نازک دل بھی ملے تو اس کو روندتا چلا جائے، انسانی اخلاق آج ہم سے رخصت ہوگیا، سکہ کے نام پر آج انسان انسان کا دشمن بنا ہوا ہے۔

تاجر اور خریدار

آج بھائی بھائی کو گاہک یا خریدار کی نظر سے دیکھتا ہے، اور ساری دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہوکر رہ گئی ہے، ایک تاجر اور دوسرا خریدار، آج دنیا کو اصرار ہے کہ ساری زندگی

اسی بازار میں گزارے، انسانوں نے انسانوں کے دلوں میں گھر کرنا، دلوں کو آباد کرنا، صورتوں پر نظر ڈالنا، اور باہمی رشتوں کو قائم رکھنا، اور ایک دوسرے کے حقوق کو سمجھنا بالکل ختم کردیا، اس دنیا میں گویا سارے رشتے ختم ہوچکے، تمام جذبات سرد پڑ گئے، اور ساری محبتیں اٹھ چکیں، اور اب ایک تاجر دوسرا خریدار بن کر زندگی گزارنا چاہتا ہے، اور ایک دوسرے کی جیب پر نظر جمائے ہوئے ہے، اس دولت نے اولاد کے دلوں سے والدین کی محبت نکال دی، چیلوں کے دلوں سے گروؤں اور استادوں کی عظمت ختم کردی، ماں باپ کے دلوں سے اولاد کی شفقت کھودی، اور ساری زندگی ایک دکان بن کر رہ گئی، بے لوث ہمدردی اور خدمت کا جذبہ نیست و نابود ہوچکا، اور حقیقی لطف اب زندگی سے اٹھ چکا، ہر شخص دوسرے کو گاہک کی نظر سے دیکھتا اور سوچتا ہے کہ کیا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ اگر دنیا میں صرف دکاندار اور گاہک ہی بستے ہوں تو کیا خاک لطف زندگی ہو۔

۱۹۴۷ء سے پہلے انگریزوں کے دورِ حکومت میں ایسے استاد دیکھنے میں آئے جو پڑھانے کا بل بنا کر دیتے تھے، اور ایک کلکٹر صاحب نے جن کالڑکا ان کے پاس آکر ٹھہرا تھا، اس کے قیام کا بل بھی بنا کر دیدیا تھا، اب تو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا ہے کہ بے جان اور بے زبان چیزیں بھی بل پیش کرنے لگیں، درخت اپنے سایہ میں کھڑے ہونے کا بل بنانے لگیں، زمین اپنے اوپر چلنے کا معاوضہ نہ طلب کرنے لگے، یہ زندگی کیا ہے؟ ایک منڈی بن گئی ہے، لیکن ساری زندگی منڈی میں کیوں کر گزرے؟

دولت کا ضرورت سے زائد احترام

سب سے پہلے ہماری نظر جب کسی پر پڑتی ہے تو اس کے لباس، معیارِ زندگی اور مالی حیثیت کو دیکھتے ہیں، اس کے اخلاق اور اس کی انسانیت کی ہمارے بازار میں کوئی قدر و قیمت نہیں، آج انسان بالشتیوں کی طرح ایک سونے کے پہاڑ کے گرد چکر لگا رہے ہیں، مگر میں پوچھتا ہوں کہ آج ہمیں کون سی چیز زندگی کی حقیقی خوشی اور لذت سے

آشنا کر رہی ہے؟

پیغمبروں نے انسانوں کو بتلایا تھا کہ اگر تم نے اپنے کو دنیا کا تابع کر لیا، اور اپنی خواہشات کو اپنے اوپر مسلط کر لیا، تو یہ ساری زندگی غیر فطری اور بد نظم ہو جائے گی، اور ایک ایسی انارکی پھیلے گی کہ یہی دنیا تمہارے لیے جہنم بن جائے گی، اگر انسان نے اپنے کو نہیں پہچانا تو وہ اپنے مقام سے گرتا چلا جائے گا، اور انسانیت تباہ و برباد ہو گی۔

مقام انسانیت

قرآن شریف میں بتلایا گیا ہے کہ انسان کو پیدا کر کے فرشتوں کو اس کے آگے جھکایا گیا، جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسانیت کی یہ ایک تذلیل ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کے سوا کسی کے سامنے جھکے، جب کہ خدا کے بعد اس کے فرشتے ہی سب سے زیادہ جھکنے کے قابل تھے، کیوں کہ وہ اس عالم کے کار پرداز ہیں، وہ اللہ کے حکم سے بارش لاتے ہیں، ہوائیں چلاتے ہیں، جس طرح ایک حاکم اپنے نائب کا اپنے اہل کاروں سے تعارف کراتا ہے، اسی طرح خدا نے انسان کے آگے فرشتوں کو جھکا کر ایک تعارف یا انٹروڈکشن کرایا کہ انسان کی نسل کو قیامت تک کے لیے یہ سبق یاد رہے کہ وہ بجز خدا کے کسی کے آگے جھکنے کے قابل نہیں، مگر انسان اپنی ہستی اور ذات کو فراموش کر کے انسانیت کی تذلیل اور خون کر رہے ہیں۔

انسان کا اصل دشمن

جنگی تاریخیں صاف بتلاتی ہیں کہ بجز ہوس کی آگ، نفس کی آگ، اور پیٹ کی آگ کو بجھانے کے اور کوئی اہم مقصد حکومتوں کے سامنے نہیں رہا، کسی سیارے اور کسی مریخ سے کوئی دشمن نہیں اترا، باہر سے کوئی ستانے کے لیے نہیں آیا، کسی دوسرے ملک سے بھی ہمیں تباہ کرنے کے لیے کوئی نہیں آیا، بلکہ جو کچھ ہماری مصیبتیں ہیں، وہ ہمارے ہی ہاتھوں کی لائی ہوئی اور ہماری اخلاقی پستی کا نتیجہ ہیں۔

آپ سے پہلے جو قومیں دنیا میں تباہ ہوئیں، ان پر کسی مرض یا وبا سے تباہی نہیں آئی، بلکہ وہ اپنے اخلاق کی خرابی، دولت پرستی اور کیریکٹر کی گراوٹ سے تباہ ہوئیں، سیاسی پارٹیاں چاہے جو مرض اور بیماری بتلائیں، مگر میں تو یہی کہتا ہوں کہ اصلی بیماری انسانیت کی تباہی اور اخلاقی پستی ہے۔

آنکھوں کی ہوس

میں چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی ماہر اقتصادیات یہ ثابت کرے کہ جتنی پیداوار ہے، اس سے زیادہ آبادی ہے، کیوں کہ اللہ نے جس انسان کو پیدا کیا ہے، اس کا رزق بھی پیدا کیا ہے، مگر آج انسان کی ہوس اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ چاہے ایک سیر نہ کھا سکے، مگر اپنے پاس ایک مَن دیکھنا چاہتا ہے، یہ آنکھوں کی ہوس کبھی پوری نہیں ہو سکتی، آج فرضی ضرورتوں کی فہرست اتنی طویل ہو چکی ہے کہ جس کی تکمیل کبھی ہو ہی نہیں سکتی، ہماری ضرورتوں کا پورا کرنا اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے، مگر اللہ نے یہ ذمہ نہیں لیا کہ آپ چار موٹروں کی ہوس کریں، آپ سنیما کی ہوس کریں، آپ روپیہ جمع کرنے کی ضرورت سمجھیں، آج اگر انسانوں میں سکون پیدا ہو سکتا ہے، اگر زندگی بہتر بن سکتی ہے، تو اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ ایک اچھا قانون تلاش کریں۔

مذہب کو کسی سفارش کی ضرورت نہیں

مذہب کو کسی کی سفارش کی ضرورت نہیں، جو لوگ مذہب کو ایک مظلوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، میں ان لوگوں میں نہیں، ہماری مصیبتیں، ہماری پریشانیاں ہمیں اس بات پر خود مجبور کرتی ہیں کہ ہم مذہب کو اپنائیں، آپ کب تک ضد کریں گے؟ اور کب تک اپنی آنکھوں میں خاک ڈالے رہیں گے؟ آخر آپ کو اپنی اس بے لطف اور تلخ زندگی کا چسکا کب تک پڑا رہے گا؟ آج میں دعوی کے ساتھ کہتا ہوں کہ کوئی قانون اور کنٹرول انسانوں کو بد اخلاقی اور جرائم سے نہیں روک سکتا، بلکہ خدا کا خوف، اس کا مذہب سے تعلق،

انسانوں سے محبت ہی ہماری بیماریوں کا واحد علاج ہے، آج افسوس یہ ہے کہ اس لمبے چوڑے ملک میں جس میں کروڑوں انسان بستے ہیں، اور بڑے سے بڑے انسان ہیں، جو ہمارے لیے قابل فخر ہیں، مگر اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے اور روحانی اور انسانی زندگی کو رواج دینے کے لیے کوئی تحریک اور کوئی جماعت نظر نہیں آتی۔

ہم نے بہت انتظار کیا اور آخر یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہم سے بن پڑے، اس کو شروع کر دیں۔

آزادی کی حفاظت

میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آزادی حاصل کرنا تو بہت اچھا ہے، مگر اس کو برقرار رکھنا اس کے بغیر ناممکن ہے کہ ہماری اخلاقی حالت درست ہو، اور ہماری زندگی میں انسانیت زندہ ہو، دنیا کی تاریخ بتلاتی ہے کہ کوئی ملک اور کوئی حکومت بغیر اخلاقی ترقی اور انسانیت کی بقا کے قائم نہیں رہ سکتی۔

آج یہ کام ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لیے ضروری ہے، آپ اس یقین کے ساتھ اس سے تعاون کریں کہ بغیر ایک بے لوث خدمت کے جذبہ اور اخلاقی بلندی اور انسانیت کی بیداری کے ہماری زندگی کی مصیبتیں دور نہیں ہوسکتیں۔

یورپ زندگی سے مایوس ہے

یورپ جو آج دنیا کا امام بنا ہوا ہے، اپنی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی سے مایوس ہو رہا ہے، اور زندگی کے حقیقی لطف اور اصل سکون سے محروم اور خالی ہاتھ ہے، اور اپنی مادہ پرستی سے بددل ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کا فرض منصبی

مسلمانوں سے میں صاف کہتا ہوں کہ آپ کو جتنا اصرار خدا کی وحدانیت پر، خدا کی ذات پر اور خدا کے دین پر ہے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ آپ دنیا میں اس اعلان کو عام کرتے

اور اس دبی ہوئی حقیقت کو ابھارتے، دوسرے بھائیوں کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے، مگر آپ نے تو اس کی فکر تک نہ کی، آپ دوسرے ملکوں پر نظریں لگانا چھوڑ دیں، اپنے اسلاف کی تاریخ پر نظر ڈالیے کہ اسپین میں لنگر انداز ہونے پر جب طارقؒ نے اپنے جہازوں کو آگ لگوادی، جب ان سے دریافت کیا گیا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو تلوار پر ہاتھ ڈال کر جواب دیا کہ جو بزدل جہازوں کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہو، وہ ناامید ہو جائے، لیکن ہمارا معبود تو صرف ایک اللہ ہے، جو حیّ وقیوم ہے، ہم اس کے پیغام کو لے کر آئے ہیں، اور اب ہمیں اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے، آپ اس ملک میں توحید کا تحفہ دے سکتے ہیں، اور یہ تحفہ قبول کرنے کے قابل ہے، میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ تم اس ملک میں رہنے کا فیصلہ کرو، کوئی مانے یا نہ مانے، مگر تم اس ضرورت کو محسوس کرو۔

ہر چیز اپنے مقام سے ہٹی ہوئی ہے

اس ملک کا سدھار اس وقت تک نہیں ہوسکتا، جب تک بے لوث خدمت، صحیح جذبہ، اخوت ومساوات اور انسانی ہمدردی کا جذبہ نہ پیدا ہوا، انسان کی زندگی کا اصل مقام اور حقیقی مقصد خلیفۃ اللہ (خدا کا نائب) ہونا ہے، مگر تم ایک سکہ کے پاؤں تلے اپنا سر رکھنے لگے، تم نے سکہ کو جیب میں جگہ دینے کے بجائے اپنے دلوں میں اور دماغوں میں جگہ دی، گھر گھر جو شوالہ اور مسجد بنی ہوئی ہے، وہ روپے کا شوالہ اور مسجد ہے، جہاں روپے کی پرستش ہورہی ہے، خدا کے نائب اور سچے پرستار بن جاؤ، اس زندگی کی چول بیٹھ جائے گی، تم اپنے مقام پر آجاؤ، ہر چیز اپنے مقام پر آجائے گی[1]۔

---

(۱) یہ تقریر ۲۲؍جنوری ۱۹۵۴ء رات کو ساڑھے سات بجے ٹاؤن ہال (غازی پور) کے ایک جلسۂ عام میں ہوئی، جس میں ہندو مسلمان تعلیم یافتہ اصحاب کی کافی تعداد تھی۔ ماخوذ از ''پیام انسانیت'' (صفحہ ۴۹ تا ۶۶)۔

دنیا کی موجودہ کشمکش یہ نہیں کہ برائی دور ہو، بلکہ یہ کہ برائی ہماری نگرانی اور انتظام میں ہو

ہمّت شکن تجربے

اس وقت دنیا کی تقسیمیں بڑی بے رحم ہیں، پہلے قوموں اور سلطنتوں نے ملکوں کو بانٹا تھا، مگر اب سیاسی تحریکوں نے قوموں اور محلوں کو بانٹ دیا ہے، مذہب کی آڑ میں ایسے فتنے نہیں تھے، جتنے آج کی مہذب دنیا اور جمہوری دور میں نظر آرہے ہیں، آج کے سیاسی پلیٹ فارم لوگوں کو جدا کرنے کے لیے یا اپنے گروپ بڑھانے کے لیے مخصوص ہیں، لیکن اب بھی بے غرضی سے پکارا جاتا ہے، تو لوگ اب بھی جواب دینے کو تیار ہیں، ابھی اس کا امکان ہے کہ سیاسی پلیٹ فارم کے علاوہ بھی لوگ جمع ہوجائیں، ہم نے خالص انسانی مسئلوں پر غور کرنے کی دعوت دی، ہمارا دل بہت خوش ہے کہ آپ نے دعوت قبول کی، آپ کا سیاسی تحریکوں سے گھبرانا تعجب نہیں، انسان اپنے تجربوں ہی سے نتیجے نکالتا ہے، آدمی بار بار جن چیزوں کو ہوتے دیکھتا ہے، اس سے قاعدہ بنالیتا ہے، آج اغراض کے لیے جمع کرنے کی عادت ہے، آپ ہم پر بھروسہ کریں، ہم کسی پارٹی کے ماؤتھ پیس (Mouth piece) یا لاؤڈ اسپیکر نہیں ہیں، ہمارے سامنے خالص انسانیت کا مسئلہ ہے۔

سب ٹھیک ہورہا ہے لیکن میرے اہتمام سے ہونا چاہیے

دوستو! اس وقت کا انسان اصل بگاڑ سے آنکھیں بند کر کے کہتا ہے کہ سب ٹھیک

ہورہا ہے، لیکن میز ے اہتمام سے ہونا چاہیے، جو کچھ ہو میری نگرانی اور چودھرائیت میں ہو، بداخلاقی و بے مروتی، چور بازاری، دولت سمیٹنے کی ہوس سب ٹھیک ہے، لیکن اس کی تولیت (Trusteeship) ہمارے سپرد ہو تو خوب ہے، آج سب کے دل کی خواہش یہی ہے، اور جب بھی کسی کے ہاتھ میں انتظام آیا ہے، تو اس نے لوٹ پھیر کر وہی نظام قائم رکھا، اور تھوڑی سی ترمیم کے بعد بات وہیں رہی جہاں تھی، بگاڑ کے سمجھنے میں مختلف پارٹیوں میں کچھ زیادہ بنیادی اختلاف نہیں، کوئی نہیں کہتا کہ وہ سب کچھ جو ہورہا ہے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ سب کا کہنا یہ ہے کہ جو ہورہا ہے، ہمارے ماتحت اور ہماری سرپرستی میں ہونا چاہیے، گویا اس پر اعتراض نہیں کہ کارخانہ غلط ہے، بلکہ اس پر غصہ ہے کہ ہمارا سایہ اس کے سر پر نہیں۔

یورپ اور ایشیا میں آج یہی جذبہ کام کررہا ہے

دنیا کی بڑی جنگیں اسی بنیاد پر لڑی گئیں، فرانس، انگلستان، جرمنی، روس اور امریکہ وغیرہ سب اسی جذبہ کو لے کر اٹھے، انھوں نے لفظوں کو آڑ بنا کر یہ مطالبہ کیا کہ نو آبادیات (Colonies) کا انتظام دوسروں کے سپرد کیوں ہے؟ اور دوسری ہی قوم ہمیشہ کیوں حاوی رہے؟ انسانیت کے درد سے بے قرار ہو کر ان میں سے کوئی نہیں اٹھا تھا، ان میں کوئی حضرت مسیح کا مذہب جاری کرنے، اور دنیا کے ساتھ انصاف کرنے، فسق و فجور، فحاشی اور عیاشی اور ظلم و زیادتی مٹانے نہیں اُٹھا تھا، نہ انگریز، نہ جرمن، نہ روس، نہ امریکہ، انھیں اچھے برے، ظلم و انصاف، حق و باطل سے کچھ بحث نہ تھی، حاشا وکلا انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ہم دنیا کو صحیح نظام زندگی دیں گے، اور انسانیت کی خدمت کریں گے، ان کے پیش نظر یہ تھا کہ ہم لوگ سونے چاندی کی گنگا بہائیں گے، اور ملکوں کے ذخیروں اور دولتوں سے فائدہ اٹھائیں گے، وہ دنیا پر اپنی اجارہ داری (Monopoly) قائم کرنا چاہتے تھے، یہ سب ایک نظام زندگی پر ایمان لائے تھے کہ تمام دنیا کو پامال کر کے انسانوں کی لاشوں پر

عیش وعشرت کی محفل رچائیں گے، اور آدمیت کے ملبہ پر اپنی قومی شوکت کا محل تیار کریں گے، سب تر سے ہوئے ندیدے، دولت کے بھوکے، خواہشات کے غلام، شراب خوار، قمار باز، خدا کو بھولے ہوئے، فطرت صحیح کے خلاف بغاوت کرنے والے تھے، دل رحم سے خالی، انسانیت کے درد سے عاری، انھیں کے نقش قدم پر آج قوم اور ملک، ذاتیں اور برادریاں، سیاسی پارٹیاں، قومی ادارے، اور قوم پرست حکومتیں چل رہی ہیں، سب کا جذبہ یہ ہے کہ ہم اور ہمارے رفیق اور ساتھی اور عزیز واحباب موج کریں، وہ موجودہ حالت کو (Accept) کر لیتے ہیں، ان کو صورت حال سے کوئی اختلاف نہیں، صرف ان لوگوں سے اختلاف ہے جن کے ہاتھ میں باگ ڈور ہے، وہ دنیا بدلنا نہیں چاہتے، صرف اس کی امامت وقیادت (Leadership) بدلنا چاہتے ہیں، ان کی کوشش صرف یہ ہے کہ دوسروں کی جگہ پر ہم آجائیں، آپ کے یہاں مقامی انتخابات ہوتے ہیں، ڈسٹرکٹ بورڈ، میونسپلٹی ٹاؤن ایریا وغیرہ کے انتخاب میں نئے نئے لوگ آتے ہیں، لیکن کیا کوئی نئی ذہنیت، نیا اصول زندگی، نیا جذبۂ خدمت اور نیا جذبۂ اصلاح لے کر آتا ہے؟ کیا کوئی نیا بورڈ، نئی کمیٹی بداخلاقیوں کی روک تھام کرتی ہے؟ انسانوں کی بے لاگ خدمت کرتی ہے؟ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی ذہن، ایک ہی اصول زندگی اور ایک ہی جذبہ لے کر آتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، زندگی کی خرابیاں اور سوسائٹی کے جھول جوں کے توں رہتے ہیں۔

پیغمبروں کا مطالبہ زندگی کا نقشہ غلط ہے

اس کے برخلاف پیغمبر کہتے ہیں کہ سرے سے زندگی کا نقشہ غلط ہے، اسے ادھیڑ کر پھر سے بناؤ، اس میں پھر سے رنگ بھرو، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی نے ایک شیروانی سلی سلائی لے لی، وہ اس کے جسم پر چست نہیں ہوتی، وہ اس کو اِدھر اُدھر سے کترتا ہے، کھینچتا ہے، پیغمبر کہتے ہیں کہ یہ بخیے غلط لگ گئے ہیں، جب تک یہ بخیے رہیں گے، اس میں

جھول ہی جھول رہیں گے، اسے ادھیڑ کر پھر سے بناؤ۔

قوموں کو رشوت دی جا رہی ہے

آج ساری دنیا نے انسان کو اپنی خواہشات میں آزاد مان لیا ہے، ان غلط خواہشات کے خلاف جذبہ پیدا کرنے کے بجائے آج ساری پارٹیاں اسے رشوت دے رہی ہیں، خواہشات کی رشوت، اخلاقی رشوت، اور ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر کہہ رہی ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں نظام حکومت آ گیا تو ہم تمہاری خواہشات کو پورا کریں گے، اور تم کو عیش و ترقی کا پورا پورا موقع دیں گے، اگر اپنی خواہشات کی تکمیل اور آزادی چاہتے ہو تو ہمیں ووٹ دو، آج ہر ایک یہ کہہ رہا ہے کہ ہم اقتدار پا کر تمہارے تعیّشات میں اضافہ کریں گے، تمہارا معیار زندگی اونچا کریں، گویا انھوں نے مٹھائیاں دے کر بچوں کی عادت بگاڑ دیں، انھوں نے ان کو مٹھائیوں پر لگا دیا، دنیا کے انسان بچہ ہیں، پارٹیاں اور حکومتیں انھیں خواہشات کی ہوا دے رہی ہیں، اور ان کی عادتیں بگاڑتی جا رہی ہیں، انسان کا حال یہ ہے جتنا اسے دیے جاؤ وہ اور مانگتا جاتا ہے، فلم آتے ہیں، تو اس کی ہوس اور بڑھتی ہے، یہ اور زیادہ ہیجان (Excitement) چاہتا ہے، اور زیادہ عریاں تصویریں مانگتا ہے، یہ دنیا کے منتظم انسانی خواہشات پر لگام نہیں لگاتے، بلکہ ان کی ہوس کے مطابق دیتے جاتے ہیں۔

پیغمبروں کا یہ راستہ نہیں، وہ خواہشات میں توازن و اعتدال پیدا کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہر شخص کی خواہش پورا کرنے کی کوشش غیر فطری ہے، پیغمبر کہتے ہیں کہ انسانوں کا چٹورپن خطرناک ہے، اس کو چھڑانا چاہیے، چاہے بچے کا دل بُرا ہو، چاہے وہ کچھ دیر روئے اور مچلے، اس کو برداشت کرنا چاہیے اور صحیح راستہ پر لگانا چاہیے، یہ غلط فلسفہ ہے کہ خواہشات کو بریک نہ لگایا جائے، اور ان کو شہ دی جاتی رہے، اور جب ان کا فساد ظاہر ہو جائے تو پھر حیرت سے دیکھا جائے اور شکایت کی جائے۔

منھ زور اور بے لگام گھوڑوں کی ریس

سیاسی پارٹیوں کا نظام غلط ہے کہ اس زندگی کے نظام کو قبول کرلیا جائے، منھ زور گھوڑا، بے لگام اور غلط رو گھوڑا انسانیت کی کھیتی کو روندتا چلا جارہا ہے، آج تمام پارٹیاں اس کا سائیس بننا چاہتی ہیں، منھ زور بے لگام گھوڑوں کی ریس ہے، کیا ان کے سامنے انسانی ضمیر کی کوئی قیمت ہے؟ انسانی ہمدردی کا کوئی جذبہ ہے؟ یورپ اور امریکہ ہمدردی اور مساوات کا نام لیتے ہیں، ان کی ہمدردی کے پیمانے ہم سب کو معلوم ہیں، بیچارے باہر سے ہمدردی کرنا چاہتے ہیں، اور اندر وہی ہوس کا بھوت ہے، ظلم کے وہاں بڑے عجیب و غریب طریقے ہیں۔

حکومت اور عہدہ کا کون اہل ہے؟

دوستو! ہم کہتے ہیں کہ زندگی کا راستہ منزل سے بہت دور جا پڑا، جب تک خدا کا یقین (Belief) نہ پیدا کیا جائے، سدھار نہیں ہوسکتا، اس کے بغیر ہم ظالم کو محتاط اور ہمدرد نہیں بنا سکتے ہیں، میں الل ٹپ آپ کے سامنے نہیں آ گیا، میں مطالعہ کے بعد کہہ رہا ہوں کہ جب تک آپ یقین نہ پیدا کریں، انسانیت کے اصلی ماڈل (Model) تک نہیں پہنچ سکتے، اس کے اندر سے عزت و عہدہ کی محبت، دولت کی محبت نکال دیجیے، اور ایثار و قربانی اور دوسروں کے لیے گھلنے کا جذبہ پیدا کیجیے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا کہ عہدہ اسے ملے گا جو اس کا خواہشمند نہ ہو، وہاں یہ (Qualification) تھی، آج اس کے برخلاف بے حیائی سے خود اپنی قصیدہ خوانی کر کے حکومتیں بنائی جاتی ہیں، صحابہ کرام اس سے بھاگتے تھے، حضرت عمرؓ معافی چاہتے ہیں کہ اس ذمہ داری کے بوجھ سے مجھے معاف رکھا جائے، انھیں مجبور کیا جاتا تھا کہ آپ دست بردار ہوگئے تو کون انتظام کرے گا؟ وہ جب تک کرتے تھے، اسے بڑی ذمہ داری اور بوجھ سمجھتے تھے، اور جب سبک دوش ہوتے تو بڑا سکون (Relief) محسوس کرتے تھے، حضرت خالدؓ کو سپہ سالار اعظم

(Commander-in-chief) بنایا گیا تھا، سب طرف ان کی دھاک بیٹھی تھی، عین محاذ پر ایک معمولی پرچہ مدینہ سے آتا ہے کہ خالد برطرف کیے جاتے ہیں، اور ان کی جگہ ابوعبیدہ مقرر کیے جاتے ہیں، تو ذرا بھی ملال نہیں ہوتا، بڑی فراخ دلی سے کہتے ہیں کہ اگر میں اس کام کو عبادت و فرض سمجھ کر کرتا تھا، تو اب بھی انجام دوں گا، اور اگر عمرؓ کے لیے کرتا تھا تو کنارہ کش ہو جاؤں گا، پھر لوگوں نے دیکھا کہ وہ اسی ذوق وشوق سے اپنے کام میں مشغول رہے، اور کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

جاہ طلب سیاسی

آج سیاسی پارٹی سے کسی کو الگ کر دیا جاتا ہے تو پہلے نکلنے کا نام نہیں لیتا، اڑا رہتا ہے، فتنہ مچاتا ہے، اور اگر الگ ہوتا ہے، تو دوسری سیاسی پارٹی بنالیتا ہے، یہ کیوں؟ اس لیے کہ عزت کی ہوس، دولت کا شوق اور بڑائی کا خیال دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے، پس جب تک موجودہ زندگی کا سانچہ نہیں بدلتا، سدھار مشکل ہے، میں آپ کو صاف صاف زندگی کی حقیقتیں بتلا رہا ہوں، خدا کا خوف اور اس کی رضا کا شوق پیدا کیجیے، روحانی اور اخلاقی زندگی پیدا کیجیے، زندگی سے لطف اندوز ہونے، (Enjoy) کرنے کا شوق جو زندگی کا آئیڈیل (Ideal) بن گیا ہے، اسے چھوڑیے۔

انسانی ضروریات کی فہرست بہت طویل نہیں

انسانی ضروریات کی فہرست بہت لانبی نہیں، فضولیات (Luxuries) کی فہرست بہت لانبی ہے، سب نے اپنی بنیاد (Luxuries) پر رکھی ہے، زندگی کے تعیش کو مقصود بنالو، معدہ اور نفس کو معبود مان لو، خدا کو نہ مانو، اس کی بالادستی کا انکار کرو، انسان کو ایک ترقی یافتہ جانور تسلیم کرو، اور اس کی زیادہ سے زیادہ خواہشات کو پورا کرو، یہ سب اسی کا فساد ہے، جب تک یہ بنیاد باقی ہے ہزار کوششوں کے باوجود سدھارنا ممکن ہے، کسی شہر اور ملک کی تو کیا، ایک میونسپلٹی کے رقبہ کی بھی اصلاح نہیں ہوگی۔

خراب اجزا اور اکائیوں سے اچھا مجموعہ تیار نہیں ہوسکتا

آج انسانی افراد اور سوسائٹی کے اجزا خراب اور ناقص ہیں، غلط بنیادوں پر ان کا اٹھان ہوا ہے، اور غلط طریقہ پر ان کی تربیت اور نشو ونما ہوا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ آج سارے انسانی مجموعے خراب و ناقص اور کمزور ہیں، جماعتیں افراد سے بنتی ہیں، جب تک افراد درست اور صالح نہیں ہوں گے جماعتیں اور جماعتی کام کیسے درست ہوسکتے ہیں؟ افراد کا سوال چھیڑا جائے تو لوگ چڑھتے ہیں، اور ناراض ہوتے ہیں، اور اس مسئلہ کو ٹال دینا چاہتے ہیں، اور اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ اجتماعی حالت میں یہ نقص خود بخود دور ہوجائے گا، عجب لطیفہ ہے کہ جب اینٹیں بھٹہ سے نکلیں تو کہنے والے نے کہا کہ یہ پیلا ہے، یہ کھنجڑ ہے، یہ اینٹیں اچھی نہیں، یہ عمارت کا بوجھ نہیں اٹھا سکیں گی، آپ نے جواب دیا: محل بن جانے دو، وہ سب اینٹیں اچھی ہوجائیں گی، لیکن خراب اور ناقص اجزا سے ایک اچھا مجموعہ کیسے تیار ہوسکتا ہے؟ بہت سے خراب ممبروں سے ایک اچھی باڈی (Body) کیسے بن سکتی ہے؟ خراب تختوں سے ایک اچھا جہاز کیسے بن سکتا ہے؟ ہم کہتے ہیں، یونٹ (Units) خراب ہیں، مسالہ (Material) خراب ہے، اس سے اچھی باڈی کیسے بنے گی؟ اس سے اچھی میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کیسے بنے گا؟ اس سے اچھی گورنمنٹ کیسے بنے گی؟ آج ساری دنیا میں یہی ہورہا ہے، (Material) تو کوئی نہیں دیکھتا، اور نتیجہ کو دیکھ کر کوفت ہے، کیا یہ ناسمجھی کی بات نہیں، پیغمبر تختے بناتے ہیں، یونٹ (Units) بناتے ہیں، اینٹیں بناتے ہیں، ان کی تعمیر پائدار، صالح اور جاندار ہوتی ہے، وہاں دھوکا نہیں ہوتا، آج تعلیم گاہوں میں بھی اس حقیقت کو نظر انداز کیا جارہا ہے، یقین اور اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کہیں نہیں کی جارہی ہے، افراد کی تربیت کا انتظام کہیں نہیں، ہر جگہ سے غیر تربیت یافتہ افراد کے کھیپ کے کھیپ نکل رہے ہیں، آج طالب علم ہر کام کرسکتا ہے، اس لیے کہ اس کی کوئی تربیت نہیں کی گئی، میونسپلٹی میں کون لوگ ہیں؟ ڈسٹرکٹ بورڈ میں کون لوگ ہیں؟ حکومت میں کون لوگ ہیں؟ سارے نظام پر اس طرح کے لوگ حاوی ہیں،

انھیں کے ہاتھ میں زندگی کی باگیں ہیں، آج اکثر انسان انسان نہیں، انسان نما ہیں۔

حقیقت ظاہر ہو کر رہتی ہے

حقیقت ظاہر ہو کر رہتی ہے، چاہے اس پر کتنا ملمع چڑھا دو، گدھے نے شیر کی کھال پہن لی تھی، لیکن جب خطرہ سامنے آیا تو ہیبت سے اپنی بولی بول دی، آج سب جگہ یہی ہو رہا ہے، اندر کی چیز باہر آرہی ہے، آپ میں سے بہت سے بھائی انتھک کوشش کر رہے ہیں، آپ میں سے بہت سے مخلص (Sincere) ہیں، لیکن کیا کبھی آپ نے نیچے سے سدھار کی کوشش کی؟ لوگ پارٹی کے اقتدار کے پیچھے پڑے ہیں، لیکن کرنے کا کام یہ تھا کہ آدمیت کا احترام پیدا ہو، خدا کا خوف پیدا ہو۔

خدا کی بستی دکان نہیں ہے

خدا کی بستی کو دکان سمجھ لیا گیا، ہر ایک دوسرے سے گاہک سمجھ کر معاملہ کرتا ہے، یہ تاجرانہ ذہنیت تباہ کن ہے، آج سب طرف لینا ہی لینا عام ہے، کہیں استاد شاگردوں کی کشمکش، کہیں مزدوروں اور کارخانہ داروں میں چپقلش، یہ سب کیوں؟ یہ سب اسی تاجرانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے، پیغمبر کہتے ہیں کہ سب کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں، اور سب کے ذمہ فرائض ہیں، فرائض ادا کرنے میں مستعد ہوں، اور حقوق حاصل کرنے میں فراخ دل، ہم یہی کہتے ہیں کہ آپ لوگ بھی یہی کرنے لگیں تو فضا بدلے گی، زندگی کا لطف آئے گا، آج لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے، ہر ایک کی نگاہ تجوری پر ہے، انسان کی مجبوری پر نہیں۔

ہمارا پیغام

ہم اپنے پیغام کو ہر پارٹی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، اور ہمارا وجود ہر پارٹی سے زیادہ ضروری ہے، کیوں کہ ہمارا کام ہو گیا تو انسانیت کا مہکتا ہوا گلدستہ بنے گا، آج کانٹے پیدا ہو رہے ہیں، آج انسان عنقا ہے، ہم کہنے آئے ہیں کہ انسانیت کی بہار لاؤ، انسانیت کو نکھارو، آج انسانیت کے درخت سے کانٹے اور کڑوے کسیلے پھل پیدا ہو رہے ہیں،

آپ انسانیت کے میٹھے پھل پیدا کیجیے، ہم آپ کے کاموں میں روڑا اٹکانے نہیں آئے، ہم یہ کہنے آئے ہیں کہ انسانیت کی خبر لیجیے، ہم اس بگڑی ہوئی دنیا کے خلاف خلش پیدا کرنے آئے ہیں، کاش یہ چبھن پیدا ہو، یہ پیغمبروں کا کام اور ان کا پیغام ہے، ہم اسے یاد دلانے آئے ہیں، کوئی دماغ تک رہ جاتا ہے، کوئی پیٹ تک پہنچ جاتا ہے، کوئی کپڑوں اور مکان میں اٹک کر رہ جاتا ہے، لیکن مذہب خدا کے یقین اور محبت کے ساتھ دل میں اتر جاتا ہے، وہ آنکھوں کی کھٹک اور جلن دور کرتا ہے، آنکھوں کی سوئیاں نکالنا پیغمبروں ہی کا کام ہے، انھیں کی محنتوں سے دل کی پھانسیں نکلیں اور قلوب کو اطمینان ملا۔

ہم مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم نے پیغمبروں کے کام اور پیغام کی بڑی ناقدری کی، تم مجرم ہو، تم اصل سرمایہ کو چھوڑ کر ذلیل سرمایہ داروں کے ایجنٹ بن گئے، تم نے بھی تاجرانہ ذہنیت اپنالی اور بیوپاری بن گئے، تمہاری حیثیت بیوپاری اور ملازم کی نہیں تھی، تم یہاں داعی کی حیثیت سے آئے تھے، تم نے داعیانہ حیثیت اور اپنے آنے کا مقصد کھودیا، تم دعوت ومحبت کے پیام کے ساتھ جیتے تو عزت سے جیتے اور کامیاب و بامراد جیتے رہتے، اب تمہاری فلاح اسی میں ہے کہ تم اپنی کھوئی ہوئی حیثیت اختیار کرو، دنیا کی فلاح اس میں ہے کہ وہ پیغمبرون کے پیغام کی قدر کرے، سیاسی پارٹیاں اور مختلف جماعتیں قیادت کی جنگ اور غلبہ واقتدار کی کشمکش چھوڑ کر زندگی کے اس بگڑے ہوئے نقشہ کو بنانے کی کوشش کریں، اور اپنے اور اپنے متعلقین اور دوستوں کے بجائے ساری انسانیت کی فکر کریں کہ اس کے سدھار کے بغیر کسی کو چین اور امن حاصل نہیں ہوسکتا۔(۱)

---

(۱) یہ تقریر یکشنبہ ۲۴؍جنوری ۱۹۵۴ء کو ضلع مئو میں (جو ایک بڑا صنعتی مرکز ہے) ہندو مسلمانوں کے ایک مشترک جلسہ میں کی گئی، جس میں مختلف سیاسی پارٹیوں اور عقیدوں کے لوگ شریک تھے۔
ماخوذ از ''پیام انسانیت'' (صفحہ ۶۷ تا ۸۰)۔

اعلیٰ اخلاقی قدریں دل کے اندر کھوئی ہیں ان کی باہر تلاش ہے

ایک کہانی

دوستو! بچپن میں ایک کہانی سنی تھی، ایک صاحب سڑک پر کچھ تلاش کر رہے تھے، لوگوں نے پوچھا: صاحب! آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟ انھوں نے کہا: جیب سے اشرفی گر گئی ہے، اسے تلاش کر رہا ہوں، کچھ بھلے مانس بھی ان کے ساتھ تلاش میں لگ گئے، تھوڑی دیر کے بعد کسی نے پوچھا: حضرت! وہ اشرفی کہاں گری تھی؟ کہنے لگے: گری تو گھر کے اندر تھی مگر مشکل یہ ہے کہ گھر میں روشنی نہیں ہے، سڑک پر روشنی ہے، اس لیے یہاں تلاش کر رہا ہوں۔

انسان کی سہولت پسندی

بظاہر تو یہ ایک افسانہ یا لطیفہ معلوم ہوتا ہے، مگر واقعات کی دنیا میں دیکھیں گے تو یہی نظر آئے گا کہ جو چیز گھر میں کھوئی ہے، اس کی آج باہر تلاش ہے، بڑے بڑے میدانوں میں آج یہی ہو رہا ہے، کہ گھر کی چیز باہر تلاش کی جارہی ہے، کوئی چیز کھوئی تو گئی ہے اپنے اندر، مگر تلاش اس کی باہر ہے، کیوں کہ باہر روشنی ہے، آج بہت سی ایسی چیزوں کی کمیٹیوں اور جلسوں میں تلاش ہے، سکون، امن، اطمینان اندر کی چیزیں ہیں، لیکن ان کی تلاش باہر ہے، انسانیت کی قسمت اندر سے بگڑی ہے، لیکن باہر اس کو بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، جس امن وسکون اور اطمینان قلب کی ہمیں اور آپ کو ضرورت ہے، جس محبت کی

فضا، ہمدردی کی فضا، اخلاق کی فضا کی ہمیں اور آپ کو ضرورت ہے، زندگی کا جوہر اور زندگی کا قیمتی سرمایہ آج مفقود ہے، وہ سب دل کی دنیا میں کھویا ہے، لیکن وہاں اندھیرا ہے، وہاں ہماری گزر نہیں، اس لیے ہم اس کو باہر ڈھونڈتے پھرتے ہیں، ہم نے بڑا ظلم کیا کہ پہلے ہم نے دلوں میں جانے کا راستہ کھویا، اب اس کی چیزوں کو باہر تلاش کررہے ہیں، آج دنیا کے اسٹیج پر یہی ڈرامہ کھیلا جارہا ہے، دل کی دنیا میں اندھیرا ہے، وہاں برسوں سے گھٹا ٹوپ اندھیاری ہے، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، انسانی فطرت سہولت پسند ہے، اس نے کبھی یہ زحمت برداشت نہیں کی کہ دل کے اندر ڈوب کر کھوئی ہوئی قیمتی چیز کو تلاش کرلے، اس نے اسی کو آسان سمجھا کہ باہر روشنی میں اپنے گم شدہ مال کو تلاش کرے، آج قومیں حیران ہیں، بڑے بڑے حکیم و دانا سرگرداں ہیں، لیکن اس کا سرا نہیں ملتا کہ ہمارا مال کھویا کہاں ہے؟ لوگوں نے جب دیکھا کہ دل کا دروازہ نہیں ملتا اور اس پر بس نہیں چلتا، اس کو روشن اور گرم کرنے کا کچھ سامان ہمارے پاس نہیں، تو انھوں نے دماغ کی طرف توجہ کی اور انسانوں کے معلومات بڑھانا شروع کردیے، جو بات آسان تھی وہ کرنے لگے، دماغ تک پہنچنا آسان تھا، انھوں نے دل کو چھوڑ کر دماغ کا راستہ اختیار کرلیا۔

آج ہر ایک اسی قافلے کا شریک ہے، جو آرہا ہے، وہیں جارہا ہے، دل کے اندر پہنچنے کی کوشش نہیں، دنیا کی چول جب تک اپنی جگہ پر نہ آئے سدھارنا ممکن ہے، گھر میں اندھیرا ہے تو روشنی باہر سے لانا پڑے گی، اور گھر میں کھوئی ہوئی پونجی اور من کی لٹی ہوئی دولت کو وہیں تلاش کرنا پڑے گا، اگر ایسا نہ کیا تو زندگی ختم ہوجائے گی اور اس کا سراغ نہیں ملے گا۔

حقیقتوں سے کشتی نہیں لڑی جاسکتی

آج ضرورت تھی کہ ان حقیقتوں کو ابھارا جاتا، انسانوں کو زندگی کا مقصد بتایا جاتا، تعلقات درست ہوتے، انسان حیوانی سطح سے بلند ہوتے، ایک دوسرے سے محبت ہوتی،

ایک دوسرے کے لیے قربانی کا جذبہ ہوتا، ایک دوسرے کو بھائی کی نظر سے دیکھا جاتا، رقابت کی نظریں بند ہوتیں، اعتماد اور محبت کی نظریں پیدا ہوتیں، حقیقتیں گم ہوگئیں، سب سے بڑی حقیقت حقیقتوں کی جان یہ تھی، کہ کسی نے اس دنیا کے کارخانے کو بنایا ہے، وہ اسی کی مرضی اور ہدایت کے مطابق ٹھیک ٹھیک چل سکتا ہے، اگر اس سے لڑنے کی کوشش کی جائے گی، اور اس کی ہدایات (Direction) کے مطابق کام نہیں ہوگا، تو کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا، گھڑی کی مثال لے لیجیے، جو اس کا ماہر خصوصی (Specialist) ہے، اس کی ساخت سے واقف ہے، وہی اس کی کل درست کر سکتا ہے، کوئی شخص خواہ کتنا بڑا عالم و فاضل، ذہین اور فلسفی ہو، لیکن گھڑی اس کی ذہانت اور علم سے درست نہیں ہو سکتی، وہ تو ماہر فن کے چلانے سے چلے گی، یہ دنیا جس نے بنائی ہے، اسی کی ہدایت سے ٹھیک ٹھیک چلے گی، حقیقتوں سے کشتی نہیں لڑی جا سکتی، ان کے سامنے سر جھکانا ہی پڑے گا۔

انسان دنیا کا ٹرسٹی ہے

میں اس وقت آپ سے کچھ بے لاگ باتیں کہنا چاہتا ہوں، لعنت ہے ایسی زندگی پر جس میں کبھی سچی بات نہ کہی جا سکے، آج ہر آدمی فائدہ دیکھتا ہے، اور فائدے کے پیش نظر سچ یا جھوٹ بولنے میں ذرا پس و پیش نہیں کرتا، دنیا میں ایسے آدمیوں سے سدھار ناممکن ہے، جو دو چار ایسے آدمی دنیا میں موجود ہیں، انھیں سے دنیا قائم ہے، جو ہمیشہ سچی بات کہتے ہیں، چاہے جان جائے۔

آج دنیا کے رخ پر جو نکھار اور تابانی ہے، یہ ان حق گو پیغمبروں، اللہ کے بھیجے ہوئے انسانوں کے خونِ جگر کا نتیجہ ہے، جنھوں نے انسانیت کی فلاح اور قیام کے لیے اپنی زندگیاں نثار کر دیں، اور اس طرح سے اس مقدس ورثہ اور گراں قدر متاع کے ہم وارث ہوئے، انسانیت کی نجات کا راستہ وہی درخشاں راستہ ہے، جسے ان لوگوں نے دکھایا، آج بھی جب تک ہم یہ نہ سمجھیں کہ دنیا ہمارے لیے ہے اور ہم خدا کے لیے ہیں، ہم اس کے

متولی (Trustee) اور امین ہیں، اور خدا کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ ہیں، انسانیت کی مشکلیں حل نہیں ہوسکتیں، یہ تھا راستہ مشکل اور کانٹوں بھرا، لیکن یہی انسانیت کا راستہ تھا، یہ ایک ذمہ داری کی بات تھی، لوگوں نے اس سے گریز کیا اور کلچر اور تہذیب کا نام لینا شروع کر دیا۔

انسانیت کا مسئلہ پرانی تہذیبوں سے حل نہیں ہوسکتا

دنیا کی تمام تہذیبیں قابل احترام ہیں، خصوصاً اپنے ملک ہندوستان کی تہذیب ہمیں عزیز ہے، یہ ہماری میراث ہے، اور ہم اس کی قدر کرتے ہیں، لیکن انسانیت کا صحیح ارتقاء پرانی تہذیبوں سے نہیں ہوسکتا، ان چیزوں میں اب جان نہیں رہی، ان کی صلاحیت اب ختم ہوگئی، یہ اپنا مشن (Mission) پورا کر چکیں، یہ اپنا پارٹ ادا کر چکیں، ان کے بہت سے پہلو اب بھی بہت اچھے ہیں، لیکن آج انسانیت کے عروج کے لیے اور عام اخلاقی گراوٹ کو روکنے کے لیے ان میں کوئی جان نہیں، ان کے پاس کوئی پیغام نہیں، جس طرح ایک جگہ کی چیز دوسری جگہ نصب (Adjust) نہیں کی جاسکتی، دو ہزار برس کی چیز آج کے ماحول میں کام نہیں دے سکتی، عربوں کی پرانی تہذیب و رومیوں اور یونانیوں کی تہذیب اپنے اپنے وقت کی زندہ اور ترقی یافتہ تہذیبیں تھیں، لیکن اب وہ اپنا نمو اور شادابی کھوچکیں، اب ان کی جگہ صرف آثار قدیمہ میں ہے۔

تہذیبیں انسانیت کا لباس ہیں، انسانیت لباس تبدیل کرتی رہی ہے

انسانیت تہذیبوں سے بالاتر ہے، یہ سب تہذیبیں مل کر بھی آدمیت کو جنم نہیں دیتیں، آدمیت تہذیبوں کو جنم دیتی ہے، آدمیت کسی زمانے اور کسی مقام سے مخصوص نہیں، تہذیبیں اس کا لباس ہیں، اور اپنا لباس بدلتی رہتی ہے، اور اپنے سن اور اپنے ذوق کے مطابق اپنے کو آراستہ کرتی رہتی ہے، اور یہ بالکل قدرتی اور ضروری ہے، جو بچہ ہے وہ بچوں کا لباس پہنے گا، جو جوان ہے، وہ جوانوں کا چولا بدلے گا، بچوں کا جوان کو نہیں پہنایا

جا سکتا، انسانیت کوکسی خاص دور یا کسی خاص ملک کے کلچر کا پابند نہ کیجیے، انسانیت کو بڑھنے دیجیے، انسانیت آبِ حیات کا چشمہ ہے، اسے ابلنے دیجیے، یہ صحرا، ریگستان اور میدانوں میں دوڑنا چاہتا ہے، اسے بڑھنے اور پھیلنے دیجیے، مذہب کے عالمگیر اور زندہ اصولوں اور اپنی ذہانت اور ذوق سے انسانیت کا ایک نیا نمونہ اور ایک نیا پیکر پیدا کیجیے، انسانیت کا، اخلاق کا ایک نیا گلدستہ بنائیے، وہ تازہ اور شاداب گلدستہ ہوگا، جو پھول سوکھ گئے، مرجھا گئے، ان کو گلے کا ہار بنانے پر اصرار نہ کیجیے۔

مذہب روح دیتا ہے، کلچر ایک ڈھانچہ

مذہب اور تہذیب کا راستہ الگ ہے، مذہب روح دیتا ہے، اور کلچر ایک ڈھانچہ (Model)، مذہب طریقۂ حیات اور زندگی کا ایک ضابطہ دیتا ہے، کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے، پھر آزاد چھوڑ دیتا ہے، مثال کے طور پر تہذیب کہتی ہے کہ سیٹھے کا قلم مقدس ہے، اور مذہب کو اس سے بحث نہیں کہ لوہے کے قلم سے لکھا جائے یا فونٹن پن سے، اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ سچ ہو اور اچھا، مذہب مقصد حیات عطا کرتا ہے، اور زندگی کو روح دیتا ہے، وہ انسانی زندگی پر کنٹرول قائم رکھتا ہے، مگر اس سے حرکت اور نشوونما کی صلاحیت نہیں چھینتا، کلچر کا احیاء انسان کی نجات نہیں، چاہے یہ کام ہندو کرے یا مسلمان یا عیسائی۔

رسم الخط یا ضمیر و اخلاق

آج اس پر بڑا معرکہ برپا ہے کہ ملک کی زبان کیا ہونی چاہیے؟ کس رسم الخط میں لکھنا چاہیے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کے درد کا مداوا اسی میں ہے، ملک کا سدھار اسی پر موقوف ہے، دوستو! پیغمبروں کے سوچنے کا یہ طریقہ نہیں، ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تحریر کہاں سے شروع کی جائے، اور کہاں ختم کی جائے، دائیں سے شروع ہو کر بائیں طرف یا بائیں سے شروع ہو کر دائیں طرف، ان کو تو اس سے دلچسپی ہے کہ لکھنے والا

سچا، خدا سے ڈرنے والا، امانت دار اور فرض شناس ہو، پھر وہ کسی طرح لکھے، وہ اچھا ہوگا، میں نے بنارس میں کہا تھا کہ اگر دستاویز جھوٹی ہے تو کیا دائیں سے شروع کرنے، اور اردو یا فارسی میں لکھنے سے، یا بائیں سے شروع کرنے اور ہندی یا انگریزی میں لکھنے سے وہ سچی ہو جائے گی؟ جھوٹی اور جعلی دستاویز کو جس طرح اور جس طرف سے لکھو گے، وہ جھوٹی اور جعلی اور پاپی رہے گی، سچی دستاویز کو جس طرح اور جس طرف سے لکھو گے، وہ سچی رہے گی، پیغمبر رسم الخط کے پیچھے نہیں پڑتے، وہ اس ہاتھ کو درست کرنا چاہتے ہیں جو قلم سے کام لیتا ہے، بلکہ وہ اس دل کو درست کرنا چاہتے ہیں، جو ہاتھ کو حکم دیتا ہے۔

پیغمبر وسائل نہیں پیدا کرتے مقاصد عطا کرتے ہیں

پیغمبروں کا کام یہ نہیں کہ اپنے زمانہ میں نئی نئی ایجادیں کریں اور آلات اور مشینیں تیار کریں، وہ اس طرح کے انسان پیدا کرتے ہیں، جو ان مصنوعات اور وسائل کو صحیح مقصد کے لیے صحیح طریقے پر استعمال کر سکیں، یورپ وسائل پیدا کرتا ہے، پیغمبر مقاصد عطا کرتے ہیں، انھوں نے مشینیں نہیں ڈھالیں، آدمی ڈھالے تھے، یورپ نے مشینیں بنائیں مگر انھیں استعمال کون کرے؟ درندہ صفت انسان؟ آج ساری مصیبت یہ ہے کہ وسائل بہت ہیں، ایجادات بہت ہیں، سامان بہت ہے، مگر صحیح طریقے پر استعمال کرنے والا آدمی نایاب ہے۔

انسانیت کو غمخوار انسانوں کی ضرورت ہے

انسانیت کو آج ایمان و یقین، سچائی اور پاکیزگی، محبت و مروت اور ہمدردی، غمخواری کی ضرورت ہے، اس کا مداوا تہذیب نہیں، تحریر نہیں، اس کو ضرورت ہے غمخوار انسانوں کی، دردمند انسانوں کی، جو دوسروں کے لیے گھلیں اور اپنے کو مٹا کر دوسروں کو بنائیں، تحریروں اور تہذیبوں سے انسانیت نہیں پیدا ہوتی، یورپ نے ہم سے اخلاق اور روحانی اقدار (Values) چھین لیے، اس معاملہ میں وہ خود خالی ہاتھ تھا، اس نے ہمیں

بھی دیوالیہ بنادیا، اس نے ہماری جھولیوں کو اخباروں سے بھر دیا، معلومات سے بھر دیا، مصنوعات سے بھر دیا، اس نے ہماری راتوں کو چراغوں سے جڑ دیا، بجلی کے قمقموں سے جگمگا دیا، ہمیں دل کی روشنی کی ضرورت تھی، اس نے دل کا چراغ گل کر دیا، مبارک تھا وہ زمانہ جب دل کی روشنی تھی، بجلی کی روشنی نہیں تھی، آپ خود سوچیں آپ سے کوئی سودا کرنا چاہے تو آپ کو کون سا زمانہ پسند ہے؟ انسانیت کا، ہمدردی کا، غمخواری کا زمانہ، جس میں آدمیت کی قدر اور فکر تھی، یا وہ زمانہ جس میں انسانیت کا کوئی احترام نہیں، مگر اس میں پریس ہیں، بجلی کی روشنی ہے، اور برقی پنکھے ہیں؟ آج سکون قلب میسر نہیں، لیکن پیسہ کی افراط ہے، آج سب کچھ ہے، لیکن روحانی قدریں عنقا ہیں، آج سب کچھ ہے، لیکن مقصد نہیں، جس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہوں، پیاس سے تڑپ رہا ہو، اسے چلو بھر پانی چاہیے، اس کے لیے سب کچھ کچھ نہیں، اس کے لیے اشرفیاں موجود ہوں تو کیا؟ بس تمدن میں محبت کا ذرہ نہیں، ایثار و ہمدردی کا نام نہیں، جسے دیکھو غرض کا بندہ، اس تمدن کو لے کر کیا کریں؟

ہم نے دل کا راستہ کھو دیا

ساری غلطی یہ ہو رہی ہے کہ صحیح دروازے سے آنے کی کوشش نہیں کی جاتی، چور دروازے سے داخل ہوتے ہیں، دل کا پھاٹک بند ہے، اور اندر جانے کا راستہ وہی تھا، دل کا راستہ ہم کھو چکے، ہم خود غرضیوں کے ساتھ وہاں نہیں پہنچ سکتے، دنیا کا بگاڑ، بیجا غرور اور خواہشات کا اقتدار، اور ان سب کا دہانہ دل ہے، اس دل میں جب ایک خدا کا اقتدار نہیں، اسے اس کی بالادستی تسلیم نہیں، یہ اپنے کو اس کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتا، تو پھر اس کی شکایت کیا، کسی کو پھر کیا غرض ہے کہ وہ کسی کی مدد کرے، اور دوسرے کے لیے اپنے کو خطرے میں ڈالے؟ آج کی دنیا میں بھائی بھائی کو تاجرانہ ذہن سے دیکھتا ہے، ہر ایک نے دوسرے کو گاہک اور فریق سمجھ لیا ہے، سب طرف لوٹ کھسوٹ (Exploitation) کا بازار گرم ہے، فطرت انسانی مسخ ہوگئی ہے، باپ بیٹوں سے نالاں ہیں، استاد شاگردوں

سے ناخوش ہیں۔

نظام تعلیم کا نقص

آج یونیورسٹیوں میں کہرام مچا ہوا ہے کہ شاگرد ادب نہیں کرتے، اور استاد شفقت و ہمدردی نہیں برتتے، تمام لوگ اس سے پریشان ہیں، اور اس کی اصلاح کی طرح طرح کی کوششیں ہوتی ہیں، لیکن اس کی جڑ اور بنیاد پر غور نہیں کیا جاتا کہ تعلیمی نظام جس کا سارا ڈھانچہ مادہ پرستی پر ہے، آخر اس کے نتائج کیا ہوسکتے ہیں؟ تعلیم کا کون سا اسٹیج ہے جہاں اخلاق اور کردار کی تعمیر کی کوشش کی جاتی ہے؟ یہ تمام برائیاں تو متوقع نتائج ہیں اس نظام تعلیم کے، تمہارا ادب، تمہارا آرٹ، نفسانی خواہشات کو بیدار کرتا ہے، اور انسان کو موقع پرست (Opportunist) بناتا ہے، اور پھر تمہارا ماحول ایسے مواقع بہم پہنچاتا ہے کہ خواہشات اور خود غرضیوں کی تسکین ہوسکے، وہ تمہیں دولت مند، ساہوکار بننے کا جذبہ دیتا ہے، اس وقت ضرورت ضمیر اور ذہن بدلنے کی ہے، ان کے بدلے بغیر کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

ذہنیت کی تبدیلی کی ضرورت

آج ہمارے ملک میں کئی اصلاحی اور سماجی تحریکیں چل رہی ہیں، ہم ان کی قدر کرتے ہیں، اور ہمارا بس چلے تو ہم ان کی مدد کریں، خصوصاً بھودان تحریک، لیکن زمین لینے سے پہلے دلوں میں یہ بات پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ کوئی زیادہ زمین ہی نہ رکھ سکے، لوگ خود بخود زمین دینے کو تیار ہوجائیں، ایسی ذہنیت بن جائے کہ لوگ ضرورت مندوں کو اپنی چیزیں دے کر خوشی محسوس کریں۔

ہم نے تاریخ میں یہ واقعہ پڑھا ہے کہ مکہ اور مدینہ میں پشتینی رقابت تھی، ان کے کلچر اور (Social Life) میں اختلاف تھا، لیکن جب مکہ سے لوگ مدینہ آنے پر مجبور ہوئے، اور انھیں اپنا سارا اثاثہ اور مال و دولت چھوڑ کر خالی ہاتھ مدینہ آنا پڑا، تو جن کے پاس کچھ نہ

تھا، وہ مدینہ کے مالدار کھاتے پیتے لوگوں کے بھائی بنا دیے گئے، انھوں نے اپنے ان نئے بھائیوں کو سینے سے لگایا، اور جن سے کوئی خونی رشتہ نہیں تھا، ان کے سامنے اپنے گھر کی آدھی دولت لا کر رکھ دی، ادھر ان آنے والوں کے دل ایسے بنائے گئے تھے، اور ان کی ایسی تربیت کی گئی تھی، کہ انھوں نے ان کو دعا دی اور ان کا شکریہ ادا کیا، اور کہا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہمیں آپ کچھ تھوڑا سا قرض دیدیجیے، اور بازار کا راستہ بتلا دیجیے، ہم مکہ میں بھی تجارت کرتے تھے، یہاں بھی تجارت کریں گے، پیغمبر اسلام نے مدینہ والوں میں ایثار و ہمدردی اور قربانی کا جذبہ بیدار کیا، اور مکہ والوں میں خود اعتمادی اور خودداری کا، انھوں نے گھر کی دولت آنے والوں کے قدموں پر ڈال دی، اور آنے والوں نے دولت پر نگاہ نہ کی اور اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنی محنت سے کمانے کا فیصلہ کیا۔

ہمارا سر نیچا ہو جاتا ہے، جب آج کی ہجرت پر نظر ڈالتے ہیں، نہ ایک طرف ایثار و ہمدردی ہے، نہ دوسری طرف خود اعتمادی اور خودداری۔

ہم کہتے ہیں کہ ذہنیت بدلیے، محبت پیدا کیجیے، ایسے دل پیدا کیجیے جو دوسروں کے غم میں گھلنے کی آرزو کریں، زمین کی تقسیم سے پہلے انسان کے اندر یہ آگ پیدا کرنی تھی کہ اس سے کسی کی مصیبت دیکھی نہ جائے، کمیونزم انتظام اور اسٹیٹ سے کام لیتا ہے، مذہب دل کی کیفیت ایسی بناتا ہے کہ اشرفیاں سانپ بچھو معلوم ہونے لگیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہوئے، وہ نماز جس کے لیے آپ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، جس کے لیے آپ بے چین رہتے تھے، اور بلالؓ مؤذن سے کہتے تھے کہ اذان دے کر میری تسکین کا سامان کرو، اسی نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، لیکن اچانک گھر میں واپس جاتے ہیں، پھر واپس آکر نماز ادا کرتے ہیں، پوچھا گیا کہ آپ کو کون سا ضروری کام یاد آیا کہ نماز چھوڑ کر واپس تشریف لے گئے؟ فرمایا کہ تھوڑا سا سونا رکھا تھا، میں اسے غریبوں میں تقسیم کرنے کی ہدایت کر آیا۔

کوئی زبان غیر نہیں

میں مسلمانوں سے کہوں گا کہ ہمت بلند کرو، تمہارا کسی زبان سے بیر نہیں، تمہیں کسی زبان سے وحشت نہیں ہونی چاہیے، تم نے فارسی کو اپنایا، تم ہندی کو کیوں نہ اپناؤ، ایسی سندر زبان جو ہمارے ملک کی زبان ہے، لیکن میں اپنے ہندو بھائیوں سے کہوں گا کہ وہ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ انسانیت کا سدھار نہ اِس زبان میں ہے، نہ اُس زبان میں، نہ اِس کلچر میں ہے، نہ اُس کلچر میں، نہ اِس تہذیب میں، نہ اُس تہذیب میں، آپ انسان میں قربانی کا جذبہ، نیکی کا جذبہ پیدا کیجیے، اسے انسان بنائیے، انسانیت کا احترام سکھایئے، آج انسانیت کا ضمیر (Conscience) بگڑ چکا ہے، وہ اپنی قوم اور اپنے ملک ہی کو دیکھنے کا عادی بن چکا ہے، سفید فام کہتے ہیں کہ بحر اوقیانوس (Atlantic Ocean) سے اس طرف انسان ہی نہیں، ہر ملک کے باشندے اپنے سوا کسی کو انسان نہیں سمجھتے، ہر طرف جتھ بندی ہے اور خود غرضی، روس کے کمیونسٹوں کے سامنے ایک طبقہ کا مفاد ہے، امریکہ کے سرمایہ داروں (Capitalists) کے سامنے دوسرے طبقے کا مفاد، ایک کو سرمایہ دار نظر نہیں آتا، ایک کو کاشتکار، ایک کے نزدیک دنیا میں مزدور ہی مزدور ہیں، دوسرے کے نزدیک کاشتکار ہی کاشتکار، تیسرے کے نزدیک سرمایہ دار ہی سرمایہ دار، یہ قوم پرستی، یہ تنگ نظری بڑی خطرناک چیز ہے۔

خدا پرستی کی تحریک کی ضرورت

آج خدا پرستی اور انسانیت دوستی کی تحریک کی ضرورت ہے، آج اس کے لیے ایک زبردست مہم (Campaign) کی ضرورت ہے، ایک زلزلے کی ضرورت ہے، خدا پرستی کی آندھی کی ضرورت ہے، جو بڑی بڑی خود غرضیوں کے پہاڑوں کو ہلا دے، خواہشات کے ٹیلوں کو اڑا دے، شہر شہر، گاؤں گاؤں یہ کہتا ہے کہ حیوانی زندگی باقی رکھنے کے لائق نہیں، مادہ پرستی کا درخت کھوکھلا ہو چکا ہے، نفس پرستی کا درخت جو دنیا پر چھایا ہوا ہے،

جڑیں چھوڑ چکا ہے، انسانو! اپنی قدر پہچانو، زندہ حقیقتوں سے اپنی قسمت باندھو، اللہ کی زبردست طاقت سے جڑ جاؤ۔

علم واخلاق کے تعاون کی ضرورت

ہم کو وہ سنّیاسیت اور جوگ مطلوب نہیں، جو دنیا سے کنارہ کشی کی تعلیم دے اور اپنی جگہ غاروں اور پہاڑوں پر تلاش کرے، ہم اس روحانیت کی دعوت دیتے ہیں جو زندگی کے ساتھ چلتی ہے، بلکہ زندگی کی رہنمائی کرتی ہے، میں رجعت پسند نہیں، میں (Reaction) کا قائل نہیں، انسانیت کے لیے یہ ضروری ہے، اور انسانیت کا تقاضا اور اس کی مانگ ہے کہ اخلاق، علم وسائنس اور خدا پرستی مل جل کر چلیں، آج اس کا توازن بگڑ گیا، ان میں تعاون اور اعتماد (Co-operation) نہیں رہا، سائنس ایک طرف جارہی ہے، تو اخلاق ایک طرف، دونوں انتہاپسند (Extremist) ہیں۔

مادہ پرستی اور روحانیت

یہی حال مادہ پرستی اور روحانیت کا ہے، ایک دنیا کو نگل لینا چاہتا ہے، اسے پوجتا ہے، ایک اس سے نفرت کرتا ہے، اور اس سے بیزار ہے، ہم یہ کہتے ہیں کہ اسے خدا کا عطیہ سمجھ کر، اللہ کی نعمت سمجھ کر اس کے قانون کے مطابق استعمال کرو، اسے اپنا غلام سمجھو، خود اس کے غلام نہ بن جاؤ، نہ اس زندگی کی پرستش کرو، نہ اس سے نفرت کرو، خدا کے سامنے اپنے کو جواب دہ سمجھو، اور اس کی عدالت کے سامنے حاضر ہونے کا اور جزا وسزا کا یقین کرو، اس کے بھیجے ہوئے بے غرض اور مخلص پیغمبروں پر اعتماد کرو، انھیں سے اس زندگی کے اصول اور ضوابط حاصل کرو، اپنے کو خدا کا بناؤ، یہ دنیا تمہاری بن جائے گی۔(۱)

---

(۱) یہ تقریر ۲۷/جنوری ۱۹۵۴ء کو شب میں گورکھپور کے ٹاؤن ہال میں کی گئی، حاضرین میں شہر کے تعلیم یافتہ ہندو مسلمان حضرات تھے۔ ماخوذ از ''پیام انسانیت'' (صفحہ ۸۱ تا ۹۶)۔

نفس پرستی یا خدا پرستی

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے!
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

صاف اور کھری باتیں

دوستو! میں اس وقت آپ سے کچھ دل کی باتیں کہنا چاہتا ہوں، اور اس طرح کہنا چاہتا ہوں جیسے میں آپ میں سے ہر ایک کے ساتھ تنہا بیٹھا ہوا گفتگو کر رہا ہوں، فی الواقع اگر اس کا کوئی امکان ہوتا کہ آپ میں سے ہر دوست سے الگ ہی الگ اپنے دل کی بات کہہ سکتا تو ضرور ایسا کرتا، تا کہ آپ اسے تقریر سمجھ کر نہیں، بلکہ ایک دوست کا دردِ دل سمجھ کر سنتے، مگر کیا کروں ایسا ممکن نہیں ہے، اگر یہ چیز ممکن ہوتی تو الیکشن میں کھڑے ہونے والے امیدوار ضرور اس پر عمل کرتے، اور وہ اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں جلسے منعقد نہ کرتے، اس لیے کہ انھیں ان جلسوں میں وہ باتیں کہنا ہوتی ہیں، جو تنہائیوں میں لے جا کر کسی کے کان میں بھی کہنا گراں ہوتی ہیں، یعنی اپنی تعریف، اپنی اہلیت کا اظہار، اور اپنی شان میں اپنے آپ ہی قصیدہ خوانی، اس لیے میں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ سے یہ درخواست کروں کہ براہِ کرم میری گزارشات کو اسٹیج کی نہیں، بلکہ دل کی باتیں سمجھ کر سنیے۔

نفس پرستی یا خدا پرستی

دوستو اور بزرگو! دنیا میں زندگی کے بہت سے طرز رائج ہیں، اور اس کی بہت سی قسمیں سمجھی جاتی ہیں، مشرقی زندگی، مغربی زندگی، جدید طرز زندگی، قدیم طرز زندگی وغیرہ

وغیرہ، لیکن حقیقت میں زندگی کی بنیادی قسمیں صرف دو ہیں، ایک نفس پرستانہ زندگی، دوسری خدا پرستانہ زندگی، باقی جتنی قسمیں جتنے مختلف ناموں سے مشہور ہیں، وہ سب ان ہی دو کی شاخیں ہیں۔

پہلی قسم کی زندگی یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ایک شتر بے مہار سمجھ کر زندگی گزارے اور جو من میں آئے وہ کر گزرے، اس کو من مانی زندگی بھی کہہ سکتے ہیں، دوسری قسم کی زندگی ایک ایسے آدمی کی زندگی ہے، جو یقین رکھتا ہے کہ اسے کسی نے پیدا کیا ہے، وہ پیدا کرنے والا ہی اس کی زندگی کا مالک اور حاکم ہے، وہ اس کی ضرورتوں اور مصلحتوں کو سب سے زیادہ جانتا ہے، اس کی طرف سے زندگی گزارنے کے کچھ ضابطے اور قاعدے ہیں، جن کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

نفس پرستی خدا پرستی سے ہمیشہ برسر پیکار رہی ہے

ہندوستان میں مہابھارت ایک بہت بڑی تاریخی لڑائی ہوئی ہے، مجھے اس کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں ہے، مگر اس دنیا میں ایک دوسری مہابھارت بھی پائی جاتی ہے، یہ ہندوستان کی مشہور مہابھارت سے زیادہ قدیم ہے، یہ وہ لڑائی ہے جو خدا پرستی اور نفس پرستی کے درمیان ہمیشہ سے جاری ہے، یہ لڑائی کسی ایک ملک ہی تک محدود نہیں رہی ہے، بلکہ دنیا کے ہر ہر ملک میں پہنچی، اور نہ یہ جنگ کے میدانوں ہی تک محدود رہی، بلکہ اس کے معرکے گھروں کے اندر بھی ہوئے ہیں، یہ زندگی کے دو اصول ہیں، جو ہمیشہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، حضرات پیغمبران نے اپنے اپنے وقتوں میں ہر جگہ خدا پرستانہ زندگی کی دعوت دی ہے، اور ان کی کامیابی کے دور میں اسی قسم کی زندگی کا دور دورہ رہا، لیکن نفس پرستی ہمیشہ کے لیے کبھی فنا نہیں ہوئی، بلکہ اسے جب بھی موقع ملا وہ زندگی پر قابض ہوگئی، بدقسمتی سے ہمارا زمانہ وہ ہے، جس میں نفس پرستی زندگی پر پوری طرح مسلط ہے، زندگی کا ہر شعبہ اور ہر میدان اس کی گرفت میں آیا ہوا ہے، گھروں میں

نفس پرستی، بازاروں میں نفس پرستی، دفتروں میں نفس پرستی، کارخانوں میں نفس پرستی، گویا ایک سمندر ہے، جو خشکی میں پورے زور شور سے بہہ رہا ہے، اور ہم اس میں گلے گلے اترے ہوئے ہیں۔

نفس پرستی مستقل ایک مذہب ہے

نفس پرستی اب مستقل ایک مذہب بن چکا ہے، نہیں! بلکہ ہمیشہ سے اس کی یہ نوعیت رہی ہے، اور عموماً اسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد سب سے زیادہ رہتی ہے، ہر چند کہ مذاہب کی فہرست میں اس نام کا کوئی مذہب نہیں بتلایا جاتا، اور نہ اس نام سے کسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد کا شمار کیا جاتا ہے، مگر یہ اپنی جگہ بالکل حقیقت ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے، اور اس کے ماننے والے سب سے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں، آپ کے سامنے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے اعداد وشمار آتے ہیں، کہ عیسائی مذہب کے پیرو اتنے، اسلام کے پیرو اتنے، اور ہندو دھرم کے ماننے والے اتنے، مگر ان میں سے ہر ایک میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو کہلاتے تو ہیں مذہباً عیسائی، ہندو، اور مسلمان، لیکن درحقیقت اسی مذہب نفس پرستی کے پیرو ہیں۔

نفس پرستی کی زندگی کا رواج، اور اس مذہب کی مقبولیت صرف اس وجہ سے ہے کہ آدمی کو اس میں مزہ بہت آتا ہے، مانا کہ نفس پرستی کی زندگی بڑے مزے کی اور بڑے لطف کی زندگی ہے، اور ہر آدمی کی طبعی خواہش لطف اندوزی ہوتی ہے، لیکن اگر دنیا کے تمام انسانوں کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو پھر اس قسم کی زندگی دنیا کے لیے ایک لعنت ہے، اور اس کی ساری مصیبتیں اور سارے دکھ اسی نفس پرستی کا نتیجہ ہیں، اور دنیا کی ساری تباہیوں، تمام قحطوں، اور ناانصافیوں کی ذمہ داری انھیں لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو اس منحوس مذہب کے پیرو ہیں۔

اس دنیا میں اس مذہب کی گنجائش صرف اس صورت میں نکل سکتی ہے کہ پوری دنیا

میں صرف ایک انسان کا وجود ہو، اسی صورت میں وہ اپنے نفس کی مانگوں کو من مانے طور پر پورا کرنے کا حقدار ہوسکتا ہے، لیکن واقعہ یوں نہیں ہے، اس دنیا کے پیدا کرنے والے نے اس میں کروڑوں اور اربوں انسانوں کو بسایا ہے، اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ نفس، خواہشاتِ نفس اور ضروریات نفس لگی ہوئی ہیں، ایسی صورت میں جو شخص بھی من مانی زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے، وہ گویا اس واقعہ سے آنکھ بند کرتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کے اور بھی ہم جنس رہتے ہیں، لیکن واقعہ سے آنکھیں بند کرنے سے واقعہ غلط نہیں ہو جاتا، وہ اپنی جگہ پر رہتا ہے، اس لیے کچھ لوگوں کی نفس پرستی کا نتیجہ لامحالہ دوسروں کی مشکلات اور مصائب کی شکل میں نکلے گا۔

نفس پرست من کا راجہ ہوتا ہے

نفس پرستی کی زندگی گزارنے والا من کا راجہ ہوتا ہے، من کا راجہ وہ راجہ ہے لہ ساری کائنات میں بھی اس کی خواہشات کا سکہ چلے، تو اس کا پیٹ اتنے میں بھی نہیں بھر سکتا، وہ اس سے اور زیادہ کا خواہش مند رہے گا، غور فرمایئے! جب یہ ساری کائنات بھی ایک من کے راجہ کی تسکین کے لیے ناکافی ہے، تو آج جو ایک ایک گھر کی محدود سی دنیا میں کئی کئی من کے راجہ پائے جاتے ہیں تو وہ کیوں کر تسکین اور چین پاسکتے ہیں؟ اس نفس پرستی کے مرض نے ایک ایک گھر میں چار چار من کے راجہ پیدا کر دیئے ہیں، باپ بھی راجہ، ماں بھی رانی، بیٹا بھی راجہ اور بیٹی من کی راجہ رانی، تو کیوں کر گھروں میں چین اور سکون رہ سکتا ہے؟ یہ نفس پرستی کی زندگی جس کو ہر شخص گزار کر مزہ حاصل کرنا چاہتا ہے، ایک آگ بنی ہوئی ہے جس میں ایک گھر کے افراد بھی جل رہے ہیں، ایک ملک کی قوم بھی جل رہی ہے، اور دنیا کی پوری آبادی جھلس رہی ہے۔

نفس پرستی کی زندگی مصیبتوں کی جڑ ہے

دوستو! دنیا کی مصیبتوں کی جڑ یہی ہے کہ ہر شخص اپنے نفس کی اطاعت کرنا چاہتا

ہے، اوران مصیبتوں کا علاج یہ ہے کہ من کا کہا ماننے کے بجائے خدا کی اطاعت کرو، یہ دنیا کروڑوں کی تو کیا، دو آدمیوں کی بھی من مانی زندگی کی گنجائش اپنے اندر نہیں رکھتی، اس لیے من مانی زندگی گزارنے کے خیال کو چھوڑ دو، اوراس طرح زندگی گزارنے کی کوشش کرو جس کا پیغام اللہ کے پیغمبروں نے دیا تھا، یعنی خدا پرستی کی زندگی، اس دنیا کے پیدا کرنے والے نے ہر زمانے میں اس زندگی کے پیغامبر پیدا کیے کیوں کہ اسی طرزِ زندگی سے دنیا کا نظام چل سکتا تھا، ان پیغمبروں نے پوری طاقت سے اس طرز زندگی کی دعوت دی، اور نفس پرستی کا زور توڑنے کی اپنی طاقت بھر پوری کوشش کی، لیکن جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ پھر بھی نفس پرستی کا رواج دنیا میں مٹا نہیں، اور جب بھی خدا پرستی کی دعوت کمزور پڑی، نفس پرستی کا رواج بڑھ گیا، اوراس کا سیلاب آتے ہی دنیا کے عام لوگوں کی مصیبتیں بھی بڑھ گئیں، اورنا قابل برداشت حدتک پہنچ گئیں۔

مثال کے طور پر چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ دیکھیے، اس صدی میں نفس پرستی کی زندگی کا رواج انتہائی عروج کو پہنچ گیا تھا، ملک ملک اس کا دور دورہ تھا، یہ ایک بہتا ہوا دریا تھا، جس کے دھارے پر ہر چھوٹا بڑا بہہ رہا تھا، بادشاہ اپنی نفس پرستی میں مبتلا تھے، رعایا ان کی نقل میں نفس پرستی کا شکار تھی۔

مثال کے طور پر ایران کا حال بیان کرتا ہوں، وہاں قوم کا ہر طبقہ نفس پرستی کا بیمار تھا، شاہ ایران کی نفس پرستی کا حال یہ تھا کہ اس کی بیویوں کی تعداد بارہ ہزار تھی، جب مسلمانوں نے اس ملک کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے حملہ کیا اور ایران کا بادشاہ تخت چھوڑ کر بھاگا، تو ایسے نازک وقت میں بھی یہ حال تھا کہ اس کے ہمراہ ایک ہزار باورچی تھے، ایک ہزار گویے تھے، اورایک ہزار باز اور شکرے کے محافظ و منتظم تھے، مگر اس پر بھی اس کو افسوس تھا کہ بڑی بے سروسامانی میں نکلنا ہوا ہے، اس زمانے کے جنرل اور سپہ سالار ایک ایک لاکھ کی ٹوپی، اور ایک ایک لاکھ کا پٹکا لگاتے تھے، اونچی سوسائٹی میں معمولی کپڑا

پہننا گویا جرم تھا، لیکن اس طبقہ کی نفس پرستی نے عوام کو کن مشکلات میں مبتلا کر دیا، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ کسانوں کا حال یہ تھا کہ وہ لگان بھی نہیں دے سکتے تھے، اور زمینیں چھوڑ چھوڑ کر خانقاہوں اور عبادت گاہوں میں جا بیٹھتے تھے، متوسط طبقہ کے لوگ امراء کی ریس میں دیوالیہ ہوئے جا رہے تھے، چنانچہ معاشی لوٹ کھسوٹ برپا تھی، غرض زندگی کیا تھی، ایک ریس کا میدان تھی، ظلم وزیادتی عام تھی، ہر بڑا اپنے چھوٹے کو، اور حاکم اپنے محکوم کو لوٹنے اور اس کا خون چوسنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، اور پوری سوسائٹی میں ایک سڑاہند پھیلی ہوئی تھی، آپ سمجھتے ہیں کہ ایسی سوسائٹی میں عقائد، اخلاق اور کیریکٹر کیسے پنپ سکتا ہے، اور کس کو آخرت کی فکر اور اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس رہ سکتا ہے، ان تمام اعلیٰ چیزوں کو تو نفس پرستی کا سیلاب بہائے لیے چلا جا رہا تھا، لیکن کوئی نہ تھا، جو اس سیلاب پر بند باندھتا، اور اس دھارے کو روکتا، علماء، ادباء، اور فلاسفہ، سب اسی کے رخ پر تنکوں کی طرح بہہ رہے تھے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہی نفس پرستی کے دھارے کو موڑا

کسی میں ہمت نہ تھی جو دھارے کے رخ کے خلاف پیر کر دکھاتا، اور دھارا بھی کون سا؟ پانی کا نہیں، عام رواج کا دھارا، اس کی ہمت ایک شیر دل انسان ہی کر سکتا ہے، اللہ کو منظور تھا کہ اس دھارے کا رخ موڑا جائے، اس کام کے لیے اس نے عرب میں ایک انسان کو پیدا کیا اور اس کو نبوت عطا کی، جس کو ہم محمد رسول اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)، جنہوں نے دھارے کے خلاف صرف پیر کر ہی نہیں، بلکہ اس کا رخ موڑ کر دکھا دیا، اس وقت کسی ایسے آدمی سے کام نہیں چل سکتا تھا، جو دھارے کا رخ تو نہ موڑ سکے، بلکہ اس میں بہنے والی چیزوں کو نکال لائے، اس لئے کہ اس وقت کوئی ایسا محفوظ مقام نہ تھا، جہاں اس سیلاب کا دھارا نہ چل رہا ہو، عبادت گاہوں اور کلیساؤں تک کو تو اس سیلاب نے اپنی زد میں لے رکھا تھا، اس سمندر میں کوئی ٹاپو نہ تھا، اور اگر تھا تو وہ ہر آن

خطرے کی زد میں تھا، ایمان، اخلاق، شرافت، تہذیب، اور مختصر الفاظ میں انسانیت کی روح کو اس سیلاب سے بچانے کا کام اگر کوئی شخص کر سکتا تھا، تو وہی شخص کر سکتا تھا، جس میں دھارے کا رخ موڑ دینے کی ہمت ہو، ایسی ہستی اس وقت صرف اللہ کے اُسی آخری پیغمبرؐ کی تھی، جس نے رواج عام کے اس دھارے کو جو ایک طوفانی انداز میں نفس پرستی کی سمت میں بہہ رہا تھا، چند سال کی کوشش سے خدا پرستی کی طرف پھیر دیا، ہمیں جو چھٹی صدی عیسوی کی دنیا کی تاریخ میں ایک دم سے ایک حیرت انگیز انقلاب نظر آتا ہے، جس نے ساری زندگی اور بالآخر ساری دنیا کو متاثر کیا، اور اب بھی جو کچھ انسانیت اور خدا پرستی کا بچا کھچا سرمایہ ہے، وہ سب انھیں کی محنت کا فیض ہے۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پودا انہیں کی لگائی ہوئی ہے

ممکن ہے کہ آپ میں سے کسی کو یہ شبہہ گزرے کہ یہ کہنا تو صحیح نہیں ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر صرف نفس پرست تھے، کیوں کہ وہاں بہت سی دوسری ''پرستیاں'' بھی موجود تھیں، کچھ لوگ سورج پرست تھے، کچھ آگ کو پوجتے تھے، کچھ صلیب پوجتے تھے، کچھ درختوں کو پوجتے تھے، اور کچھ پتھروں کی پرستش کرتے تھے، ٹھیک ہے! یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے، مگر یہ تمام ''پرستیاں'' اسی ایک پرستی کی قسمیں تھیں، جس کے عام رواج کا میں دعویٰ کر رہا ہوں، یہ ساری پرستیاں اسی لیے کی جاتی تھیں کہ یہ نفس پرستی کے مخالف نہ تھیں، یہ ''پرستیاں'' من مانی زندگی گزارنے میں رکاوٹ نہیں ڈالتی تھیں، آگ، پیڑ، پتھر، سورج وغیرہ ان سے نہ کہتے تھے کہ یہ کام کرو، اور یہ مت کرو، اس لیے وہ ان کی پرستش کے پہلو بہ پہلو اپنے نفس کی اطاعت بھی کرتے رہتے تھے، ان دونوں میں کوئی تناقض نہیں پاتے تھے۔

بہر حال ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سیلاب سے لڑنے اور اس کا

رخ موڑ دینے کا بیڑا اٹھایا، اور پوری سوسائٹی سے لڑائی مول لی، حالانکہ آپ اپنی اس سوسائٹی میں بہت مقبول اور ہردل عزیز تھے، صادق وامین کے معزز لقب سے یاد کیے جاتے تھے، اوراس لیے آپ کو ترقی کے بڑے سے بڑے مواقع حاصل تھے، آپ کو اپنی قوم کا اتنا اعتماد حاصل تھا، کہ ترقی کا کوئی اونچے سے اونچا مقام نہ تھا جو آپ کو مل نہ سکتا، مگر یہ سب کچھ جب ممکن تھا جب آپ ان کی زندگی کے رخ کو غلط نہ کہتے، اور اس کو ایک دوسرے رخ پر موڑ دینے کے عزم وارادہ کا اظہار نہ فرماتے، مگر آپ کو تو اللہ نے کھڑا ہی اس لیے کیا تھا، کہ بہاؤ کے رخ پر نہ خود بہیں اور نہ کسی کو بہنے دیں، اس لیے سب سے پہلے تو آپ نے اپنی زندگی کو خدا پرستی کی زندگی کا نمونہ بنا کر پیش کیا، اور بالفاظ دیگر دھارے کے خلاف پیر کر دکھایا، اور پھر پوری سوسائٹی کے رخ کو نفس پرستی سے ہٹا کر خدا پرستی کی طرف موڑ دینے کی کوشش شروع کی۔

خدا پرستی پیدا کرنے کے لیے تین بنیادی چیزیں

اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے آپ نے تین بنیادی چیزیں لوگوں کے سامنے پیش کیں۔

(۱) یہ یقین کرو کہ تمہارا اور اس ساری دنیا کا پیدا کرنے والا، اور اس پر حکومت کرنے والا ایک ہے۔

(۲) یہ یقین کرو کہ اس زندگی کے ختم ہونے کے بعد ایک دوسری زندگی ہے، جس میں اس زندگی کا حساب وکتاب دینا ہے۔

(۳) یہ یقین کرو کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا (پیغمبر) ہوں، اس نے اس زندگی کے متعلق احکام دے کر مجھے بھیجا ہے، جن احکام پر مجھے بھی چلنا ہے، اور تمہیں بھی۔

آپ نے جب ان چیزوں کا اعلان فرمایا تو سوسائٹی میں ایک ہلچل مچ گئی، مخالفتیں اٹھ کھڑی ہوئیں، اس لیے کہ یہ نعرہ ان کی زندگی کے آرام میں خلل ڈالنے والا تھا، سارا

زمانہ جس رخ پر بہہ رہا تھا، اس کو چھوڑ کر دوسرا رخ اختیار کرنا آخر کوئی آسان کام تو تھا نہیں، زندگی کی کشتی بہاؤ پر بلا دقت کے چلی جارہی تھی، انھیں کیا پڑی تھی کہ بہاؤ کے خلاف اپنی کشتی چلا کر دقتیں اور خطرات مول لیں، اس لیے انھوں نے چاہا کہ یہ آواز دب جائے، کچھ لوگوں نے آپ کی نیت ہی پر شبہ کیا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دیکھنے میں ایک انھیں جیسا انسان اتنا صاحب عزم بھی ہوسکتا ہے کہ زندگی کے اس طوفانی دھارے کا رخ موڑنے کی ٹھانے، جس میں صرف ہم ہی نہیں، دنیا کی ساری قومیں، ان کے علماء اور حکماء، ان کے احبار ورہبان، ان کے ائمۂ تہذیب وسیاست، ان کے عقائد واخلاق، ان کے علوم وفلسفے، اور ادب وسیاست خس وخاشاک کی طرح بہے چلے جارہے ہیں، وہ اس دعوے میں کسی شخص کو مخلص ماننے سے قطعاً عاجز تھے، اس لیے انھوں نے سمجھا کہ اس دال میں کچھ کالا ضرور ہے، ہو نہ ہو اس بلند بانگ دعوے کے پیچھے کچھ اور مقصد اور کوئی اور خواہش کام کررہی ہے، اس لیے انھوں نے ایک وفد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بھیجا، جس نے اپنے خیال کے مطابق تین بڑی چیزیں آپ کے سامنے پیش کیں، اس نے کہا کہ اگر آپ کا مقصد اس قسم کی باتوں سے یہ ہو کہ ہم آپ کو اپنا سردار تسلیم کرلیں، تو چھوڑیے ان باتوں کو، ہمیں یہ منظور ہے، یا اگر آپ بہت سے مال ودولت کے طالب ہوں تو ہمیں یہ بھی منظور ہے، اور یا اگر آپ کسی حسین عورت کے خواہش مند ہوں تو ہمیں یہ بھی منظور ہے، ہم ملک کی سب سے حسین عورت آپ کو پیش کریں گے، آپ نے جو یہ نئی بات اٹھانی شروع کی ہے، اس سے دستبردار ہوجایئے، مگر اللہ کے اس سچے رسولؐ اور خدا پرستی کے سب سے بڑے علم بردار نے نہایت بے نیازی سے جواب دیا کہ میں تم سے کچھ لینا نہیں چاہتا، تمھیں کچھ دینا چاہتا ہوں، اور وہ میری یہی تین باتیں ہیں، جن کی میں تمھیں دعوت دے رہا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تمھیں موت کے بعد والی زندگی میں راحت ملے، اور وہ میری ان تین باتوں کے قبول کرنے پر موقوف ہے، آپ کی زبان ہی نہیں بلکہ آپ کی پوری زندگی نے ان لوگوں کے اس خیال کی تردید کی کہ آپ دنیا کی کسی چیز کے خواہش

مند ہیں، مخالفت نے اتنی شدت اختیار کی کہ آپ کو مکہ چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا، مگر خدا پرستی کی دعوت کو نہیں چھوڑا۔

بے نفسی اور خدا پرستی کی عجیب مثال

مخالفین کو اندازہ نہیں تھا کہ آپ نفس پرستی سے کتنی دور تھے، اور اس دھارے کے مخالف سمت تیرنے کی آپ میں کتنی طاقت تھی اور کتنا عزم تھا، آپ نفس پرستی سے اتنی دور تھے کہ جب مکہ چھوڑنے کے کچھ سال بعد آپ پھر مکہ میں آئے، اور فاتحانہ حیثیت سے آئے، اور اپنے مخالفوں کو مغلوب کر کے آئے، تب بھی آپ کی خدا پرستانہ شان میں ذرا تغیر نہ ہوا، فتح کا نشہ آپ پر ذرا بھی نہیں چڑھا، مکہ میں آپ کا فاتحانہ داخلہ اس شان سے ہوا کہ اونٹ پر سوار تھے، بدن پر غریبانہ لباس تھا، اور زبان پر خدا کا شکر اور اپنی عاجزی کا اظہار تھا، اس موقع پر ایک آدمی آپ کے سامنے آیا اور رعب سے کانپنے لگا، آپ نے فرمایا: گھبراؤ نہیں، میں قریش کی اس غریب عورت کا بیٹا ہوں، جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی، سوچیے! کیا کوئی فاتح ایسے وقت میں ایسی بات کہہ سکتا ہے، جس سے اس کا رعب لوگوں پر سے اٹھ جائے؟ ایسے وقت میں کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ رعب ڈالا جائے، آپ آج بھی دیکھتے ہیں، اور آج سے پہلے کا حال تاریخ میں پڑھ سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت و اقتدار آ جاتا ہے، ان کی آل اولاد اس سے کتنا نفع اٹھاتے ہیں، اور اس کے بل پر کیسے کیسے عیش و آرام کے مزے لوٹتے ہیں، مگر خدا پرستی کے سب سے بڑے علم بردار کا حال اس معاملہ میں بھی دنیا سے مختلف تھا، آپ کی صاحبزادی اپنے گھر کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں جس کی وجہ سے آپ کے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے، اور جسم پر مشکیزہ اٹھانے کے نشانات ہو گئے تھے، ایک دن انھوں نے سنا کہ میدانِ جنگ سے کچھ غلام اور کنیزیں ابا جان کی خدمت میں لائی گئی ہیں، خیال کیا کہ میں بھی اپنے لیے ایک آدھ غلام یا کنیز مانگ لاؤں، تشریف لے گئیں، اپنی پریشانی کا حال بیان کیا،

ہاتھوں کے گھٹے دکھائے، حضور (ﷺ) نے فرمایا: ''بیٹی! میں تمہیں غلام اور باندی سے اچھی چیز دیتا ہوں، غلام اور باندی اور مسلمانوں کے حصے میں جانے دو، تم سوتے وقت ۳۳ رمرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ رمرتبہ الحمد للہ، اور ۳۴ رمرتبہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو'' بے نفسی اور خدا پرستی کی کیسی عجیب مثال ہے! بیشک آپ خدا پرستوں کے سردار تھے، کیا کوئی پھر بھی آپ کی بے نفسی پر حرف لاسکتا ہے؟ دوسروں کے حق میں یہ فیاضی، اور اپنے اور اپنی اولاد کے لیے فقر و غربت کو ترجیح دینا پیغمبر ہی کی شان ہے ؎

عدیل ہمت ساقیت فطرت عرفیؔ
کہ حاتم دگراں و گدائے خویشتن است

آج ایسے لوگ آپ کے سامنے ہیں، جنھوں نے پیچھے کچھ دنوں میں چند روز یا چند سال جیلیں کاٹ لی ہیں، تو آج اقتدار حاصل ہونے پر ان تکلیفوں کا سارا حساب مع سود کے چکا لینے کے درپے ہیں، جب کسی شخص کو اقتدار اور قانون کی طاقت مل جاتی ہے تو عموماً وہ اپنے اعزا، اور اپنی اولاد کو قانون کی گرفت سے بچانے کی سعی کرتا ہے، مگر خدا پرستوں کے سردار کی شان اس معاملہ میں بھی بالکل نرالی تھی، ایک عورت پر چوری کا جرم ثابت ہوا، آپ نے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دے دیا، لوگوں نے حضورؐ کے ایک مقرب اور بہت محبوب صحابی سے سفارش کرائی کہ معاف فرما دیا جائے، حضورؐ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا: ''خدا کی قسم! اگر خود محمد کی (لاڈلی) بیٹی فاطمہؓ سے بھی یہ جرم سرزد ہو جائے تو محمدؐ اس کا بھی ہاتھ کاٹے گا''۔

اپنے آخری حج کے موقع پر مسلمانوں کے عظیم ترین اجتماع میں آپ نے کچھ قوانین اور احکام کا اعلان عام فرمایا تو ان کو سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں اور اپنے خاندان پر جاری کیا، آپ نے مجمع عام میں کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے تمام دستور ختم کیے جاتے ہیں، منجملہ ان کے سودی لین دین آج سے ختم، اور سب سے پہلے

میں اپنے چچا عباسؓ کے سودی قرضے کو باطل قرار دیتا ہوں، اب ان کا سود کسی پر واجب نہیں، اب وہ سود کا روپیہ کسی سے وصول نہیں کر سکتے، یہ تھی خدا پرستی! ورنہ آج کل کے قانون ساز اگر اس قسم کا قانون بنانے والے ہوں تو اپنے رشتہ داروں اور ملنے والوں سے پہلے سے کہہ دیں کہ فلاں قانون آنے والا ہے، ذرا جلدی جلدی اپنی فکر کرلو، زمینداری کے خاتمہ کا قانون پاس ہونے والا ہے، جتنی زمین نکال سکتے ہو نکال لو، یا بیچنا چاہو تو بیچ دو، ایسے ہی موقع پر آپ نے اعلان فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت (یعنی قبل اسلام) کے تمام خون باطل کیے جاتے ہیں، اب ان کا انتقام نہیں لیا جا سکتا، اور اس کے ماتحت میں سب پہلے (اپنے خاندان کا خون) ربیعہ بن الحارث کا خون باطل قرار دیتا ہوں، ہمارے حضور (ﷺ) اس بے مثال خدا پرستی کے ساتھ (جس کی صرف چند مثالیں میں نے بیان کی ہیں) نفس پرستی کے اس سیلاب سے لڑتے رہے جو دنیا کی ساری قوموں کو بہائے لیے چلا جا رہا تھا، آخر کار اس کو روکنے میں کامیاب ہوئے، اور لوگ مجبور ہوئے کہ آپ کی بات پر کان دھریں اور مانیں۔

حیرت انگیز انقلاب

چنانچہ جن لوگوں نے آپ ؐ کی ان تین باتوں کو کما حقہ قبول کر لیا، جو خدا پرستی کی زندگی کی بنیاد ہیں، تو پھر ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کا رخ ایک دم ایسا بدلا کہ آج کی دنیا میں یقین آنا مشکل ہے، کہ کیا ایسے بھی انسان ہو سکتے ہیں، میں مثال کے طور پر ان میں سے چند کا ذکر کرتا ہوں۔

آپ کی دعوت قبول کرنے والوں میں سے ایک ابوبکر صدیق بھی تھے جو آپ کی وفات کے بعد آپ کے پہلے جانشین اور اسلامی حکومت کے ذمہ دار بھی ہوئے، آپ کی بے نفسی کا حال یہ تھا کہ گو اسلامی سلطنت کے سب سے بڑے عہدیدار تھے، مگر زندگی اس طرح گزارتے تھے کہ آپ کے گھر والے منھ میٹھا تک کرنے کے لیے ترستے تھے، ایک دن

اہلیہ نے عرض کیا کہ بچوں کا جی کچھ میٹھا کھانے کو چاہتا ہے، تو فرمایا کہ سرکاری خزانہ تو ہمارا منھ میٹھا کرنے کا ذمہ دار نہیں ہے، ہاں جو کچھ وہاں سے ہمیں روزانہ ملتا ہے اسی میں سے اگر تم کچھ بچا سکو تو بچالو، اور کوئی میٹھی چیز پکالو، چنانچہ انھوں نے روزانہ کے خرچہ سے روزانہ تھوڑا تھوڑا بچا کر تھوڑے سے پیسے جمع کر لیے اور ایک دن حضرت ابوبکرؓ کو دیے کہ اس کا کچھ سامان لا دیجیے تا کہ آج کچھ میٹھی چیز پکالوں، آپ وہ پیسے لیے ہوئے خزانچی کے پاس چلے گئے، اور وہ پیسے بیت المال کو واپس کر دیے، اور فرمایا کہ یہ اسی خرچ میں سے جو ہمیں بیت المال سے ملتا ہے، اتنے دنوں میں بچایا ہوا ہے، معلوم ہوا کہ ہمارا کام اس سے کم میں چل سکتا ہے، لہٰذا اب ہمیں اتنا کم کر کے دیا جایا کرے۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں جب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا، اور حضرت عمرؓ وہاں تشریف لے گئے، ساتھ میں ایک غلام تھا، لیکن اسلامی حکومت کے اُس سب سے بڑے شخص کے پاس سواری صرف ایک تھی، تھوڑی دور خود سوار ہوتے تھے، تھوڑی دور غلام کو سوار کر کے خود پیدل چلتے تھے، جس وقت بیت المقدس میں داخل ہو رہے تھے، غلام سواری پر تھا اور خود پیدل، اور کپڑوں میں کئی ایک پیوند، آپ ہی کے زمانے میں ایک دفعہ سخت قحط پڑا، تو آپ وہ کھانا کھانا اپنے لیے جائز نہ سمجھتے تھے جو قحط کی وجہ سے عام رعایا کو میسر نہ تھا۔

حضرت خالدؓ جو مسلمان فوجوں کے کمانڈر انچیف تھے، اور خود حضور (ﷺ) نے سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا اعزازی خطاب عنایت فرمایا تھا، ایسے بے نفس اور نفس پرستی سے اس قدر آزاد تھے کہ ایک مرتبہ ان کی کسی غلطی کی بنا پر عین میدان جنگ میں ان کے پاس حضرت عمرؓ کی طرف سے معزولی کا پروانہ پہنچا، تو ماتھے پر شکن تک نہ آئی، اور کہا کہ اگر میں اب تک عمرؓ کی خوشنودی کے لیے یا اپنی ناموری کے لیے لڑتا تھا تو اب نہ لڑوں گا، لیکن اگر میں اللہ کے لیے لڑتا تھا تو سپہ سالار کے بجائے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھی

بدستور لڑتا رہوں گا، اس کے برعکس اس زمانہ کی ایک تازہ مثال آپ کے سامنے میک آرتھر کی ہے جنھیں ٹرومین نے کوریا میں لڑنے والی افواج کی سپہ سالاری سے معزول کر دیا تو وہ سخت ناراض ہوئے اور ٹرومین کی صدارت کے درپے ہو گئے۔

خدا پرست سوسائٹی

اور صرف یہی چند افراد نہیں، بلکہ آپ نے پورے قوم اور سوسائٹی کی اسی اصول پر تربیت کی تھی، کہ وہ ایک خدا پرست سوسائٹی ہو، آپ کا ایک اصول یہ تھا کہ جو کسی عہدے کا طالب اور خواہش مند ہو اس کو عہدہ نہیں دیتے تھے، ایسی سوسائٹی میں عہدے کے امیدوار بننے، اپنی تعریف وتوصیف کرنے، اور حکومت کے لیے ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کی کیا گنجائش تھی، جس جماعت کے سامنے ہر وقت قرآن مجید کی یہ آیت رہتی ہو:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَاداً، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (سورة القصص:۸۳)

''یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص رکھیں گے جو زمین میں اپنی بلندی نہیں چاہتے اور نہ فساد پھیلانا چاہتے ہیں، اور انجام خدا سے ڈرنے والوں کا ہے''۔

جس جماعت کا اس حقیت پر ایمان ہو، وہ کیا اپنی سربلندی اور فتنہ وفساد کے جرم کا ارتکاب کرسکتی ہے؟

دوستو اور بزرگو! یہ خدا پرستی کی دعوت تھی جو حضورؐ نے دنیا میں پیش کی تھی، اور نتائج کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے زیادہ نفع بخش کوشش ہے، کوئی شخص دنیا کی کسی اور دعوت کا نام لے کر نہیں بتلاسکتا کہ اس نے دنیا کو اتنا فائدہ پہنچایا، حالانکہ اس دعوت کے حصہ میں انسانوں کی اتنی کوششیں اور اتنے وسائل نہیں آئے، جو عصر حاضر کی معاشی، اقتصادی اور سیاسی تحریکوں کے حصے میں آئے ہیں، مگر پھر بھی ان تمام تحریکوں کے فائدے مل کر بھی اس ایک دعوت کے فائدوں کا دسواں حصہ بھی نہ ہوسکے۔

خداپرستی کے علم بردار نفس پرستی کے شکار

آج بھی دنیا سے معاشی اور سیاسی ظلم اور اخلاقی برائیاں جب ہی دور ہوسکتی ہیں جب دنیا اس دعوت کو قبول کر لے، لیکن اور کسی کے متعلق کیا کہا جائے، جب کہ خود اس دعوت کے علم بردار ہی نفس پرستی میں مبتلا ہو گئے، نفس پرستی تو چوٹ کھائے ہوئے بیٹھی تھی، اس نے موقع پا کر خدا پرستی کے علم برداروں سے خوب انتقام لیا، جنھوں نے اسے شکست دی تھی اور وہ مسلمان جس کا امتیاز تھا ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ افسوس آج اس نفس پرستی کا خود شکار ہے۔

مسلمانو! تم نے بڑا ظلم کیا ہے، تمہارا کام تو خدا پرستی کا نمونہ بننا تھا اور ساری دنیا کو اس کی دعوت دینا تھی، تم نے نفس پرستی کو اختیار کر کے اپنا بھی نقصان کیا اور ساری دنیا کو بھی مشکلات میں پھنسا دیا، اگر تم اپنا فرض ادا کرتے رہتے تو نہ یہ نفس پرستی دنیا میں دوبارہ غالب ہوتی اور نہ دنیا کا یہ حشر بنتا۔

دنیا کی سب سے بڑی مصیبت نفس پرستی ہے

آ دنیا کی سب سے بڑی مصیبت نفس پرستی ہے، دنیا کے بڑے بڑے لیڈر اور امن کے علم بردار (ٹرومین، چرچل اور اسٹالن) سب سے بڑے نفس پرست ہیں، یہ اپنی نفس پرستی میں اور قومی غرور میں (جو نفس پرستی کی ایک ترقی یافتہ اور وسیع شکل ہے) دنیا کو خاک سیاہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں، ایٹم بم سے زیادہ خطرناک نفس پرستی ہے جس نے دنیا کو تباہ کر دیا، لوگوں کو ایٹم بم پر غصہ آتا ہے کہ قیامت برپا کر دے گا، میں کہتا ہوں ایٹم بم کا کیا قصور؟ اصل مجرم تو اس کا بنانے والا ہے، اور اس سے پہلے بھی وہ درس گاہیں اور وہ تہذیب ہے جو اس ایٹم بم کو وجود میں لائی ہے، اور اس سب کی جڑ وہ نفس پرستی ہے جس نے اس تہذیب کو جنم دیا ہے۔

ہماری دعوت

دوستو! ہماری اور ہماری تحریک بس یہی ہے اور اسی مقصد کے لیے ہے، کہ نفس پرستی کے خلاف محاذ قائم کیا جائے، خداپرستی کی زندگی کا طریقہ دنیا میں عام کیا جائے، ہم نے اسی مقصد کے لیے یہ خاص اجتماعات کیے ہیں، اور محض اسی مقصد کے لیے ہفتہ وار اجتماع کرتے ہیں، جہاں ہم قوم کے ہر طبقہ کو جمع ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور ان کے سامنے خداپرستی کی دعوت کے سب سے بڑے علم بردار حضرت محمد (ﷺ) کی تعلیمات، ان کے حالات زندگی اور ان کے ساتھیوں کے واقعات پیش کرتے ہیں، جو سچی خداپرستی کا راستہ دکھانے والے ہیں اور ہمارے یقین کے مطابق انھیں میں انسانیت کی نجات اور دنیا کی مشکلات کا حل ہے، ہمارا کام اور ہماری دعوت ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جس کا جی چاہے پڑھ لے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین۔(۱)

---

(۱) ۲۸/نومبر ۱۹۵۴ء کی شب میں امین الدولہ پارک (لکھنؤ) میں کی گئی تقریر، اس اجتماع میں ہر مذہب وخیال کے لوگ موجود تھے، بڑی تعداد میں غیر مسلم بھی شریک تھے۔ ماخوذ از ''مقام انسانیت'' (صفحہ ۵۹ تا ۸۰)، مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۷۴ء۔

زندگی میں فرد کی اہمیت
ہمارے اصلاحی کاموں کا ایک بڑا خلا

دوستو اور بھائیو!

سب جانتے ہیں کہ ہمارے سماج اور موجودہ نظامِ زندگی میں کوئی خرابی اور کمی ہے، جس کی وجہ سے زندگی کی کل صحیح نہیں بیٹھتی اور اس کا جھول نہیں نکلتا، ایک خرابی دور کیجیے تو چار خرابیاں اور پیدا ہو جاتی ہیں، آج دنیا کے بڑے بڑے ملک بھی اس خرابی کے شاکی ہیں، اور محسوس کرنے لگے ہیں کہ بنیاد میں کوئی خرابی ہے، مگر ان کو اپنے چھٹکل مسائل سے فرصت نہیں، ہم ان مسائل کی ضرورت سے انکار نہیں کرتے، مگر ان سب مسئلوں سے زیادہ اہم مسئلہ انسانیت اور آدمیت کا مسئلہ ہے، اس لیے کہ ہماری پہلی حیثیت انسان ہی کی ہے، اور یہ سارے مسائل اس کے بعد آتے ہیں، جن لوگوں کے ہاتھوں میں زندگی کی باگ ڈور ہے، انھوں نے زندگی کی گاڑی اتنی تیزی سے چلا رکھی ہے کہ ایک منٹ کے لیے اس کو روک کر خرابی دیکھنے کے لیے تیار نہیں، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ ٹھیک پٹری پر جا رہی ہے یا نہیں، اور اس خرابی سے اس کے مسافروں اور آئندہ نسلوں کے لیے کیا خطرہ درپیش ہے؟ ان کو صرف اس کی فکر ہے کہ اس گاڑی کے چلانے والے وہ ہوں، ان میں سے ہر ایک دنیا کو اس بات کی رشوت دیتا ہے کہ اگر گاڑی کا ہنڈل اس کے ہاتھ میں ہوگا تو وہ زیادہ سے زیادہ تیز رفتاری سے گاڑی چلائے گا، امریکہ اور روس دونوں میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے، اور ہر ایک کا وعدہ ہے کہ وہ اس گاڑی کو زیادہ تیز رفتار سے چلائے گا، لیکن کسی کو سمتِ سفر

اور مقصدِ سفر سے بحث نہیں۔

اجتماعیت کا رجحان

اب میں بتلاتا ہوں کہ وہ چوک کیا ہے، اور غلطی کہاں ہو رہی ہے؟ آج دنیا میں بڑی بڑی تنظیمیں ہو رہی ہیں، اس وقت اجتماعیت پر بڑا زور ہے، ہر کام اجتماعی اور عالمگیر پیمانہ پر کیا جا رہا ہے، یہ اجتماعیت ایک خوشگوار اور ترقی پسند رجحان ہے، لیکن افراد اور ان کی صلاحیت ہر اجتماعی کام کی اور ہر تنظیم کی بنیاد ہے، اور اس کی اہمیت سے کسی دور میں انکار نہیں کیا جا سکتا، اس زمانہ کی خطرناک غلطی یہ ہے کہ افراد کی اہمیت اور ان کی سیرت و صلاحیت کو بالکل نظر انداز کیا جا رہا ہے، عمارت بنائی جا رہی ہے، مگر جن اینٹوں سے وہ بنے گی ان کو کوئی نہیں دیکھتا، اگر کوئی یہ سوال چھیڑتا ہے کہ اینٹیں کیسی ہیں؟ تو کہا جاتا ہے کہ اینٹیں ناقص سہی، کمزور سہی، مگر عمارت مضبوط اور اعلیٰ ہوگی، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سو خراب چیزوں سے ایک اچھا مجموعہ کیسے برآمد ہوگا؟ کیا خرابی جب بڑی تعداد میں جمع ہو جاتی ہے، اور ایک دوسرے میں شامل ہو جاتی ہے تو معجزہ کے طور پر اس سے ایک عمدہ چیز ظاہر ہو جاتی ہے؟ کیا سو مجرموں اور ظالموں کے مل جانے سے ایک انصاف پرور جماعت اور ایک معدلت شعار ادارہ وجود میں آ جاتا ہے؟ ہمیں تو یہ معلوم ہے کہ نتیجہ ہمیشہ مبادی اور مقدمات کے تابع ہوتا ہے، اور کُل ہمیشہ اجزا کی خصوصیتوں کا نمائندہ اور مظہر ہوتا ہے، آپ صحیح میزان نکالنا چاہتے ہیں تو جب تک اکائیاں ٹھیک نہ ہوں، میزان غلط رہے گی، یہ کہاں کی منطق اور کہاں کا فلسفہ ہے کہ افراد کو بنانے کی فکر نہیں، اور ایک اچھے مجموعہ کی توقع کی جا رہی ہے؟

مجرمانہ غفلت

آج کالجوں، تحقیقاتی اداروں، تجربہ گاہوں، تفریحی مرکزوں میں انسانی زندگی کی

ہر حقیقی اور فرضی ضرورت کا انتظام کیا جا رہا ہے، مگر ان آدمیوں کے بنانے کا کوئی انتظام نہیں سوچا جا رہا ہے، جن کے لیے یہ سب انتظامات ہیں، کیا یہ سب تیاریاں ان انسانوں کے لیے ہیں، جو سانپ بچھو بن کر زندگی گزاریں گے، جن کا مقصدِ زندگی بوالہوسی اور عیش پرستی کے سوا کچھ نہیں؟ اس دور کے انسان نے ظلم اور جرم کو منظم کیا ہے، اور اس بارے میں وہ جانور سے بازی لے گیا، کیا کبھی سانپوں اور بچھوؤں اور جنگل کے شیروں اور بھیڑیوں نے انسانوں پر کوئی منظّم اور متحد حملہ کیا؟ لیکن انسان اپنے جیسے انسانوں کو فنا کرنے کے لیے تنظیمیں اور ادارے قائم کرتا ہے، اور پوری پوری دنیا کو تباہ کر دینے کی اسکیمیں بناتا ہے، اس وقت افراد کی تربیت، سیرت کی تعمیر اور انسانیت کی صفات اور اخلاق پیدا کرنے کی طرف سے مجرمانہ غفلت برتی جا رہی ہے، یہی کام سب سے غیر اہم سمجھا گیا ہے، مشین ڈھالنے کی کتنی فیکٹریاں ہیں، کاغذ بنانے کے کتنے کارخانے ہیں، کپڑے کے کتنے مل ہیں، مگر حقیقی انسان بنانے کا بھی کوئی ادارہ، کوئی تربیت گاہ ہے؟ آپ کہیں گے یہ تعلیم گاہیں، کالج اور یونیوسٹیاں! لیکن بے ادبی معاف، وہاں انسانیت کی تعمیر اور فرد کی تکمیل پر کتنی توجہ کی جاتی ہے؟ یورپ امریکہ نے کتنے بڑے صرف اور کتنے بڑے ساز و سامان سے ایٹم بم بنایا، اگر اس کے بجائے وہ ایک فردِ کامل بناتا، تو دنیا کے لیے کتنا مبارک ہوتا، مگر ادھر کسی کا ذہن نہیں جاتا۔

ہماری غفلت کا خمیازہ

ہمارا ملک ہندوستان تاریخ میں بڑا مردم خیز ملک رہا ہے، اس نے بڑے کامل افراد پیدا کیے ہیں، مگر اب صدیوں سے اس کی طرف سے غفلت برتی جا رہی ہے، ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں نے بھی اپنے دورِ حکومت میں اس فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لیا، ان کی حکومت اگر خلافت راشدہ کا نمونہ ہوتی، اور وہ اس ملک کے منتظم اور حکمراں ہونے سے زیادہ اس ملک کے مربی اور اخلاقی معلم ہوتے، تو آج اس ملک کی اخلاقی

حالت یہ نہ ہوتی، اور وہ اس ملک کی تولیت اور انتظام سے سبک دوش نہ کیے جاتے، پھر انگریز آئے، ان کی حکومت تو صرف اسپنج (Sponge) کی طرح تھی، جس کا کام یہ تھا کہ گنگا کے دہانے سے دولت چوس کر ٹیمز (Tames) کے کنارے اگل دے، ان کے عہد میں اس ملک کا اخلاقی انحطاط کہیں سے کہیں پہنچ گیا، اب ہم کو آزادی ملی، ہمیں چاہیے تھا کہ ہم سب سے پہلے اسی بنیادی مسئلہ کی طرف توجہ کرتے! کیا یہ ملک کبھی آزاد نہیں تھا؟ پھر وہ آزادی کی دولت سے کیوں محروم ہوا؟ اپنی اخلاقی پستی اور اخلاقی کمزوریوں سے! مگر افسوس ہے کہ سڑکوں اور روشنی کی طرف بھی جتنی توجہ ہے، اتنی بھی توجہ اس بنیادی کام کی طرف نہیں ہے۔

ہر اصلاحی کام کی بنیاد

میں ''شرم دان''، اور ''بھودان'' تحریکوں کا بڑا اقدر دان ہوں، لیکن میں اس عقیدہ کو نہیں چھپا سکتا کہ اس سے بھی پہلے کرنے کا کام اخلاقی اصلاح اور صحیح احساس پیدا کرنا تھا، ہمیں تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بہت قدیم دور میں زمینیں واجبی طور پر تقسیم کی جاتی تھیں، اور کوئی کوئی دور تو ایسا گزرا ہے کہ ہوا اور پانی کی طرح زمین کو بھی ایک ضرورت کی چیز اور انسانوں کا حق سمجھا جاتا تھا، لیکن پھر انسانوں کی حرص نے ضرورت مندوں کو محروم اور بے ضرورت اشخاص کو اس کا مالک بنادیا، اگر اخلاقی احساس اور انسانیت کا احترام نہ پیدا ہوا تو پھر اسی کا خطرہ ہے کہ تقسیم شدہ زمین پر پھر قبضہ کرلیا جائے، اور ضرورت مندوں کو بے دخل کردیا جاوے، اس لیے جب تک یہ احساس نہ پیدا ہو، اور ضمیر بیدار نہ ہو، اس وقت تک ان کوششوں کے نتائج اور وعدوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، آج اخلاقی انحطاط حد درجہ کو پہنچا ہوا ہے، رشوتوں، چور بازاری، غبن اور خیانت میں کمی نہیں، بلکہ لوگوں کا کہنا ہے کہ کچھ زیادتی ہی ہے، دولت مند بننے کی خواہش جنون کو پہنچ گئی ہے، کوئی اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا، ذہنی کیفیت یہ ہے کہ ایک دوسرے کی نیکی کی آڑ لے کر بدی کرنا چاہتا ہے، جب

سب کا یہ حال ہو جاوے تو وہ نیکی پھر کہاں سے آئے گی جس کی آڑ میں اور جس کے دامن میں بدی چھپ سکے؟

میرے ایک مصری دوست نے اپنی تقریر میں اس کی ایک بڑی اچھی مثال دی، انھوں نے کہا کہ ایک بادشاہ نے ایک رات اعلان کیا کہ ایک حوض دودھ کا بھرا ہوا چاہیے، ہر شخص ایک گھڑا دودھ اس میں ڈال دے اور صبح اپنے دام لے لے، اندھیری رات تھی، ہر شخص نے یہ خیال کیا کہ میں نے اگر ایک گھڑا پانی ڈال دیا تو اتنے بڑے حوض میں کیا پتہ چلے گا، سب لوگ تو دودھ ڈالیں گے، لیکن اتفاق سے ہر شخص نے یہی سوچا اور دوسرے کی نیکی اور دیانت کے اعتماد پر بددیانتی کرنی چاہی، نتیجہ یہ نکلا کہ صبح جب بادشاہ نے دیکھا تو پورا حوض پانی سے بھرا تھا، دودھ کا نام ونشان نہ تھا، جب کسی بستی کی یہ حالت ہو جائے تو پھر اس کی کوئی حفاظت نہیں کر سکتا۔

اصل خطرہ

یاد رکھیے! اس ملک کے لیے کوئی بیرونی خطرہ نہیں، اس ملک کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ اخلاقی انحطاط، یہ مجرمانہ ذہنیت، یہ دولت پرستی اور برادر کشی ہے، کیا یونان اور روما کو کسی دشمن نے تباہ کیا؟ نہیں! بلکہ ان اخلاقی بیماریوں نے جن کا گھن ان کو لگ گیا تھا، پھر اس وقت ایک ملک کا اخلاقی انحطاط تمام دنیا کے لیے خطرہ ہے، دنیا جب ہی خوشحال اور پرامن ہو سکتی ہے، جب ہر ملک خوشحال اور پرامن ہو۔

پیغمبروں کا کارنامہ

پیغمبروں کا یہی کارنامہ ہے کہ انھوں نے صالح افراد تیار کیے، خدا سے ڈرنے والے، انسان سے محبت کرنے والے، دوسروں کے لیے تکلیف اٹھانے والے، اپنے پرائے کے معاملے میں انصاف کرنے والے، سچ بولنے والے، حق کا ساتھ دینے والے، مظلوم کی مدد کرنے والے، دنیا کے کسی فرد، کسی ادارہ اور کسی تربیت گاہ نے ایسے صالح افراد

تیار نہیں کیے، دنیا کو اپنی ایجادوں پر ناز ہے، سائنس دانوں کو اپنی خدمات پر فخر ہے، لیکن پیغمبروں سے بڑھ کر کس نے انسانیت کی خدمت انجام دی؟ ان سے زیادہ بیش قیمت چیز کس نے دنیا کو عطا کی؟ ان افراد نے دنیا کو گلزار بنا دیا، ان کی وجہ سے دنیا کی ہر چیز کارآمد بن گئی، اور ہر دولت ٹھکانے لگی، آج بھی دنیا میں جو نیکی کا رجحان، جو سچائی، انصاف اور انسانیت کی محبت پائی جاتی ہے، وہ انھیں پیغمبروں کی کوشش اور تبلیغ کا نتیجہ ہے، یہ موجودہ دنیا بھی محض ایجادات اور تمدن کی ترقیات پر نہیں چل رہی ہے، یہ محض اسی سچائی، دیانت داری، انصاف اور محبت پر قائم ہے جو پیغمبر پیدا کر گئے۔

پیغمبروں کا طریقۂ کار

پیغمبروں نے یہ صالح ترین افراد کس طرح پیدا کیے، یہ بات کچھ کم حیرت انگیز نہیں، انھوں نے ان کے اندر ایک نیا یقین پیدا کر دیا، وہ یقین جس سے دنیا اس وقت محروم تھی، جس کے فقدان نے ساری دنیا کے نظام کو درہم برہم کر رکھا تھا، اور انسان اس کو کھو کر ایک خونخوار درندہ، ایک حریص چوپایا بن گیا تھا، یعنی خدا کی ہستی کا یقین اور مرنے کے بعد کی زندگی اور جواب وہی کا یقین اور اس بات کا یقین کہ یہ سچے انسان خدا کا پیغام لانے والے اور انسان کی صحیح رہنمائی کرنے والے ہیں، اس یقین نے انسان کی کایا پلٹ دی اور اس کو ایک بے لگام جانور سے ایک ذمہ دار انسان بنا دیا۔

تاریخ کا تجربہ

ہزاروں برس کا تجربہ بتاتا ہے کہ انسان سازی کے لیے اس سے بڑی طاقت نہیں، آج دنیا کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ جماعتیں موجود ہیں، قومیں موجود ہیں، تنظیمیں اور ادارے موجود ہیں، لیکن صالح افراد نایاب ہیں، اور دنیا کے بازار میں سب سے زیادہ اسی جنس کی کمی ہے، خطرناک بات یہ ہے کہ ان کی تیاری کی فکر بھی نہیں ہے، اور سچ پوچھیے تو اگر تیاری کی کوشش بھی کی جاتی ہے، تو اس کے لیے صحیح راستہ نہیں اختیار کیا جاتا، اس کا راستہ

صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ یہ یقین پھر پیدا کیا جائے اور سب سے پہلے انسان کو انسان بنایا جائے، اس کے بغیر جرائم بند نہیں ہو سکتے، خرابیاں دور نہیں ہو سکتیں، آپ ایک چور دروازہ بند کریں گے، دس چور دروازے کھل جائیں گے، افسوس ہے کہ جن کو اس بنیادی کام کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اور جن کے توجہ کرنے سے اثر ہو سکتا ہے، ان کو دوسرے مسائل سے فرصت نہیں، اگر وہ اس مسئلہ پر توجہ کرتے تو اس سے پوری زندگی پر اثر پڑتا اور سیکڑوں مسائل اس سے حل ہو جاتے، جن پر علاحدہ علاحدہ کوشش کی جارہی ہے، اور خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

ہماری جدوجہد کا محرک

ہم نے جب دیکھا کہ اتنے لمبے چوڑے ملک میں کوئی اس کی صدا بلند کرنے والا نہیں، اور کوئی اس کو اپنی زندگی کا مقصد اور مہم بنانے والا نہیں، تو ہم اور ہمارے چند بے سروسامان ساتھی اس دعوت کے لیے اپنے گھر سے نکلے، ہم آپ کے شہر میں آئے، آپ نے ہماری پذیرائی کی، اور دلچسپی اور سکون سے ہماری بات سنی، اس کے ہم بڑے شکر گزار ہیں، اور اس سے ہماری بڑی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، ہم اسی امید پر نکلے ہیں، انسانوں کی اس وسیع بستی میں ضرور کچھ زندہ دل پائے جاتے ہیں، دنیا کا ہر کام انھیں انسانوں کے وجود کے یقین، اور ان کی زندہ دلی کے اعتماد پر کیا گیا ہے، اتنے بڑے مجمع میں ہمیں امید ہے کہ بہت سے دلوں نے ہماری اس بات کو قبول کیا ہوگا، ہم اس بات کی بھی امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے کو وہ فرد بنانے کی کوشش کریں گے جس کی آج دنیا کو ضرورت ہے، اور جس کے بغیر اس زندگی کی چول بیٹھ نہیں سکتی۔(۱)

---

(۱) ۲۱ رفروری ۱۹۵۵ء کو ٹاؤن ہال (جونپور) میں ہندو مسلمانوں کے ایک مخلوط اجتماع میں یہ تقریر کی گئی۔ ماخوذ از ''مقام انسانیت'' (صفحہ ۹ تا ۱۸)۔

ایک مقدس وقف اور اس کا متولی

رواجی جلسے

دوستو اور بھائیو! اس وقت ہمارے ملک میں جلسوں اور مجلسوں کا اچھا خاصا رواج ہے، لیکن یہ جلسے اور مجلسیں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک وہ جو بالکل ذاتی غرض اور مقصد کے لیے منعقد کی جاتی ہیں، خواہ اس کے پیچھے کوئی جماعت اور سیاسی پارٹی کام کرتی ہو یا کسی جماعت یا پارٹی کا نام لیا جاتا ہو، اس کی روشن مثال الیکشن کے جلسے ہیں، الیکشن کی بدولت قصبے قصبے، گاؤں گاؤں جلسے ہوتے ہیں، اور اس کے لیے سخت جدوجہد کی جاتی ہے، وقت صرف کیا جاتا ہے، اور روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے، جو لوگ کسی نشست کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، وہ ووٹ دینے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ انتخاب کے لیے موزوں ترین اور لائق ترین آدمی ہیں، ان جلسوں میں زندگی کے اصول اور اخلاق اور اچھا شہری بننے کی تعلیم نہیں دی جاتی، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کو زیادہ سے زیادہ ووٹ دیے جائیں، ان کے نزدیک وہی لوگ قابل تعریف ہیں، اور انھیں کی زندگی کی قیمت ہے، جو ان کی حمایت کریں، اور ان کو ووٹ دیں، خواہ وہ اخلاقی حیثیت سے پست اور اصول و سیرت اور کردار کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ کے انسان ہوں۔

دوسری قسم کے جلسے وہ ہوتے ہیں جو مذہبی رسوم یا معاشرتی (Social) تقریبات کے سلسلہ میں منعقد ہوتے ہیں، اس طرح کے جلسے مسلمانوں میں ہوتے ہیں، اور ہندوؤں میں بھی، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ مذہبی جلسے جو کبھی قوموں میں زندگی پیدا

کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتے تھے، اور اصلاح وانقلاب کا پیغام دیتے تھے، اب کوئی پیغام اور پروگرام نہیں رکھتے، اسی طرح سے وہ معاشرتی تقریبات جن سے کبھی اصلاح اور اجتماعیت کا کام لیا جاتا تھا، ایک طرح سے بے روح اور بے جان ہوگئی ہیں، اور لگے بندھے نظام کے ماتحت ہونے لگی ہیں۔

ان جلسوں کے بے اثری

ان جلسوں میں لوگ جو ذہن لے کر آتے ہیں، وہی ذہن لے کر جاتے ہیں، ان میں کوئی تغیر اور کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ ان جلسوں کی شرکت سے ایک قسم کا اطمینان پیدا ہوتا ہے، ان میں شریک ہونے والا سمجھنے لگتا ہے کہ شرکت سے وہ ہلکا اور پاک ہوگیا، اور اس نے جو پاپ کیے تھے، وہ دھل گئے، آج مذہب سے انسانوں کے دل ودماغ پر چوٹ نہیں لگتی، مذہبی تقریبات کی شرکت سے اطمینان اور سکون اور بڑھ جاتا ہے۔

مذہب غلط زندگی کا حریف ہے

حالانکہ مذہب غلط زندگی کا حریف ہے، اس کا سمجھوتہ خرابیوں، پاپ اور بداخلاقیوں سے ناممکن ہے، پہلے قسم کی زندگی گزارنے والے ان جلسوں سے کتراتے تھے کہ کہیں مذہب ان کی حرکتوں پر تنقید نہ کرے، قرآن مجید میں حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کا مکالمہ نقل کیا گیا ہے، حضرت شعیب نے اپنی قوم سے کہا: اے قوم! ناپ تول میں کمی نہ کرو، تم ڈنڈی مارتے اور کم تولتے ہو، گاہک سے زیادہ سے زیادہ لینے کی فکر میں رہتے ہو، اور اس کو کم سے کم دینے کی کوشش کرتے ہو، یہ مہا پاپ ہے! قوم نے جواب دیا کہ کیا تمہاری نماز تم کو اس کی تعلیم دیتی ہے کہ تم ہمارے اس طرز عمل پر اعتراض کرو اور ہم کو اپنے مال میں آزادانہ کارروائی کرنے سے روکو؟ قوم نے تشخیص ٹھیک کی، یہ سب رکاوٹیں نماز ڈالتی ہے، اور زندگی میں غلط اور صحیح کی تمیز کراتی ہے، ایک صحیح اور زندہ مذہب زندگی میں غلطیوں اور گناہوں پر خاموش نہیں رہ سکتا۔

بھائیو! ہمارا یہ جلسہ نئے طرز کا ہے، یہ نہ الیکشن کے جلسوں میں کا کوئی جلسہ ہے، نہ مذہبی تقریبات میں سے کوئی تقریب ہے، ہم اس جلسہ میں کوشش کریں گے کہ بتائیں کہ زندگی کا صحیح راستہ کیا ہے؟ اور انسان پستی میں کیوں گر گیا ہے؟

سب سے مقدم سوال

آپ جب کوئی کام کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ طے کرتے ہیں کہ کس نیت سے کیا جائے، اور اس معاملہ میں آپ کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی تہہ میں یہ بنیادی حقیقت کام کر رہی ہے کہ انسان نے دنیا میں اپنے کو کیا سمجھا اور اس کو کیا مقام اور پوزیشن حاصل ہے؟ اگر یہی بات صحیح سمجھ لی گئی تو ہر کام ٹھیک ہوگا، اور اسی منزل پر غلطی ہو گئی تو غلطی ہوتی ہی چلی جائے گی۔

انسان خدا کا نائب اور خلیفہ ہے

دوستو! اسلام نے ہمیں یہ بتلایا ہے کہ انسان دنیا میں خدا کا نائب، خلیفہ اللہ اور دنیا کا ٹرسٹی ہے، دنیا ایک وقف ہے، اور انسان اس کا متولی، اس کے ذمہ یہاں کا انتظام اور ہدایت کا کام ہے، دنیا میں چھوٹے بڑے بہت سے وقف ہوتے ہیں، یہ سارا عالم، یہ ساری کائنات ایک عظیم الشان وقف (ٹرسٹ) ہے، یہ کسی کی ذاتی ملکیت، یا کسی کے باپ دادا کی جائداد نہیں ہے کہ جس طرح چاہے کھائے اُڑائے، اس وقف میں جانور، چرند، پرند، درخت، دریا، پہاڑ، سونا، چاندی، سامان خوراک اور دنیا کی تمام نعمتیں ہیں، یہ سب انسان کے حوالے کی گئی ہیں، کیونکہ وہ ان کے مزاج سے بھی واقف ہے، اور ان کا ہمدرد بھی، انسان خود اسی ٹرسٹ کی مٹی سے بنا ہے، اور اسی خاک کا ہے، اور منتظم کے لیے واقفیت وعلم اور ہمدردی وتعلق دونوں شرطیں ہیں، انسان دنیا کے نفع ونقصان سے بھی واقف ہے، اور اس کے اندر اس کی ضروریات بھی رکھی گئی ہیں، اس لیے وہ اچھا ٹرسٹی بن سکتا ہے۔

مثال کے طور پر لائبریری (کتب خانہ) کا انتظام وہی اچھا کر سکتا ہے جس کو علم کا شوق ہو اور کتابوں سے لگاؤ اور دلچسپی ہو، اگر کسی کتب خانہ کا انتظام کسی جاہل کے سپرد کر دیا گیا، چاہے وہ کتنا ہی شریف اور اچھا آدمی ہو، وہ بہترین لائبریرین نہیں بن سکتا، لیکن جس کو علم کا شوق ہوگا اور کتابوں سے مناسبت، وہ اس میں کافی وقت صرف کرے گا، اس کے ذخیرے میں معقول اضافہ کرے گا اور اس کو ترقی دے گا۔

اسی طرح انسان چونکہ اسی دنیا کا ہے، اس کو اس سے دلچسپی بھی ہے، اور وہ اس کا ضرورت مند بھی ہے، اس سے واقف بھی ہے، اور اس کا ہمدرد بھی، اس کو اسی میں رہنا بھی ہے، اور اسی میں مرنا بھی، لہذا وہ اس کی پوری دیکھ بھال کرے گا اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ٹھکانے لگائے گا، یہ کام اس کے علاوہ اور کوئی اس خوبی سے انجام نہیں دے سکتا۔

دنیا کے انتظام کے لیے انسان ہی موزوں ہے

جب حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور زمین میں اپنا نائب بنایا، فرشتے جو پاک اور روحانی مخلوق ہیں، جو نہ گناہ کرتے ہیں، نہ گناہ کی خواہش رکھتے ہیں، بولے کہ اے مالک آپ ایسے کو اپنا نائب بنا رہے ہیں جو دنیا میں خون خرابہ کرے گا، ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں، اور تیری عبادت میں مشغول رہتے ہیں، یہ منصب ہم کو عطا فرما، خدا نے جواب دیا تم اس بات کو نہیں جانتے ہو، خدا نے آدمؑ اور فرشتوں کا امتحان لیا، چوں کہ آدم اسی خاک کے تھے، ان کو دنیا استعمال کرنی تھی، ان کی فطرت کو اس سے مناسبت تھی، اس لیے وہ اس کی ایک ایک چیز سے واقف تھے، انھوں نے ٹھیک ٹھیک جواب دیا، فرشتوں کو ان چیزوں سے واسطہ نہ تھا، اس لیے جواب نہ دے سکے، اس طرح خدا نے دکھا دیا کہ دنیا کے انتظام اور اس وقف کی تولیت کے لیے اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود انسان ہی موزوں ہے، بلکہ یہ کمزوریاں اور ضرورتیں ہی اس کو اس منصب کا اہل ثابت کرتی ہیں، اگر

اس دنیا میں فرشتے ہوتے تو دنیا کی اکثر نعمتیں بیکار ہی ثابت ہوتی اور ان کی وہ ترقی ہرگز نہ ہوتی جو انسان نے اپنی ضرورت اور خواہش کی بنا پر دی۔

کامیاب قائم مقام

لیکن یہ بھی آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ نائب اور قائم مقام کا فرض ہے کہ قائم مقام بنانے والے کی پوری پوری پیروی کرے، وہ اس کے اخلاق کا نمونہ اور پرتو ہو، اگر میں یہاں کسی کا قائم مقام ہوں تو کامیاب اور وفادار قائم مقام اسی وقت کہلاؤں گا جب اپنی بساط بھر اس کی نقل کروں اور اپنے اندر اس کے اخلاق پیدا کروں، خدا کی نیابت یہ ہے کہ اپنے اندر اس کے اخلاق پیدا کیے جائیں اور اس کی صفات سے مناسبت ہو، ہمیں بتلایا گیا ہے کہ اس کی صفات واخلاق میں علم، رحمت، شکر، احسان، انتظام، پاکبازی، عفو ودرگزر، بخشش وعطا، عدل وانصاف، حفاظت ونگرانی، محبت، جلال وجمال، مجرمین سے گرفت وانتقام، جامعیت ووسعت ہے۔

اخلاق خداوندی کا مظاہرہ

انسان اپنے محدود انسانی دائرے میں اور اپنی تمام بشری کمزوریوں کے ساتھ ان اخلاق خداوندی اور ان صفات اللہ کا پرتو اپنے اندر پیدا کرسکتا ہے، وہ کبھی خدا نہیں ہوسکتا، لیکن دنیا میں خدا کے اخلاق کا مظاہرہ کرسکتا ہے، اور یہی ایک سچے نائب کا کام ہے، آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اگر انسان حقیقی طور پر اپنے کو خدا کا نائب سمجھنے لگے اور اخلاق خداوندی کو اپنی زندگی کا معیار بنائے تو خود اس کی ترقی و بلندی اور اس کے دور خلافت ونیابت میں دنیا کی خوش حالی اور سرسبزی کا کیا حال ہوگا؟ مذہب انسان کا بلند ترین اور معتدل ترین تصور بخشتا ہے، وہ انسان کو خدا کا نائب اور اس زمین کے انتظام میں اس کا قائم مقام اور اس عظیم الشان وقف کا اس کو متولی قرار دیتا ہے، اس سے بڑھ کر انسان کا اعزاز اور انسانیت کی معراج نہیں ہوسکتی۔

دو متضاد تصور

مگر انسانوں نے خود دو متضاد تصور قائم کیے، کہیں تو انسان کو خدا بنایا گیا اور اس کی عبادت ہونے لگی، اور کہیں جانور سے بدتر سمجھ لیا گیا، اور اس کو گائے بیل کی طرح ہنکایا جانے لگا، بعض انسان خود خدا بن بیٹھے اور بعض اپنے کو جانور سے بدتر سمجھنے لگے، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو صرف پیٹ سے کام ہے، اور صرف نفس دیا گیا ہے، یہ دونوں تصور غلط ہیں، بلکہ صریح ظلم ہے، نہ انسان خدا ہے، نہ جانور، انسان انسان ہی ہے، لیکن نائب خدا، ساری دنیا اس کے لیے پیدا کی گئی ہے، اور وہ خدا کے لیے، ساری دنیا اس کے سامنے جواب دہ ہے، اور وہ خدا کے سامنے، یہ زمین یہ دنیا کسی کی ذاتی جائداد نہیں، ایک وقف ہے، اور انسان اس کا متولی، اس تصور اور اس عقیدے کے بغیر دنیا کی چول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتی، تاریخ کی شہادت ہے کہ جب انسان اس راہ راست سے ہٹا، اور اپنی حد سے بڑھا، اور خدا بننے کی کوشش کی، اور اپنے کو دنیا کا حقیقی مالک سمجھا، یا اپنے مرتبے سے گرا اور اپنے کو جانور سمجھا، یا دنیا کے انتظام اور تولیت سے دست بردار ہوا اور زندگی کی ذمہ داریوں اور فرائض سے اس نے گریز کیا، تو خود بھی برباد ہوا اور یہ دنیا بھی تباہ ہوئی۔

انسان کا جماداتی تصور

آج یورپ جس کے ہاتھ میں دنیا کی باگ ڈور ہے، اور وہ انسانیت کا لیڈر بنا ہوا ہے، اس نے حیوانیت کے درجہ سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا، اس نے انسان کا جماداتی تصور پیش کیا، وہ کہتا ہے کہ انسان روپیہ ڈھالنے کی مشین اور ایک کامیاب ٹکسال ہے، البتہ اس کے اندر خواہشات ہیں، لیکن سراسر حیوانی، کاش کہ وہ انسان کو صرف ایک مشین ہی رہنے دیتا، جس کے اندر اپنی کوئی خواہش اور ارادہ نہیں، ستم بالائے ستم یہ ہے کہ وہ مشین بھی ہے، اور خود غرض بھی اور مردم آزار بھی، یورپ کے اس دور قیادت میں سارا عالم ایک بے جان فیکٹری بنتا جاتا ہے، جس میں کبھی کبھی بڑا خطرناک ٹکراؤ ہو جاتا ہے، اس مشینی دور میں

لطیف انسانی جذبات واحساسات، انسان سے ہمدردی، دل کا گداز ڈھونڈھنے سے نہیں ملتا، اس ٹکسال میں کہیں خدا کا نام نہیں، اس کی سچی طلب، دل سوزی نہیں، نہ آنکھوں میں نمی ہے، نہ دل میں گرمی، نہ انسانیت کی لطافت ہے، نہ قلب وروح کی حرارت، حالانکہ جس دل میں محبت اور معرفت نہیں وہ انسان کا دل نہیں پتھر کی سل ہے، جس آنکھ میں کبھی آنسو نہ آئے وہ انسان کی آنکھ نہیں نرگس کی آنکھ ہے۔

معاشی مسئلہ یا لطف وتفریح

اب سوائے روپیہ، پیٹ اور اغراض کے کچھ نہیں، میں اپنے شہر میں صبح ٹہلنے نکلتا ہوں تو مختلف پارٹیوں اور دوستوں کی ٹولیوں کے پاس سے گزرنا ہوتا ہے، اِدھر سے دو آدمی گزرے اُدھر سے چار آدمی آئے، لیکن برسوں حسرت رہی کہ ان مسلمان اور ہندو بھائیوں سے کچھ اور سنوں، لیکن سوائے اس کے اور کچھ سننے میں نہیں آتا کہ آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟ آپ کی بالائی آمدنی کیا ہو جاتی ہے؟ آپ کا تبادلہ کہاں ہو رہا ہے؟ فلاں افسر بدمزاج ہے، فلاں افسر بہت اچھا ہے، بیٹے کی شادی میں اتنا خرچ ہوا، بیٹی کو اتنا جہیز دیا، ہمارا فنڈ اتنا جمع ہے، فلاں کا بینک میں اتنا حساب ہے، اور اب تو کرکٹ کا دور دورہ ہے، ہر جگہ کرکٹ کا تذکرہ، ہر جگہ کھیلنے والوں پر تبصرہ! میں کھیل کا مخالف نہیں، خود بھی کھیلا ہوں اور اس کا ذوق رکھتا ہوں، ورزشوں اور مردانہ کھیلوں کو مفید اور ضروری سمجھتا ہوں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہی زندگی کا ایک موضوع بن کر رہ جائے، اور صبح سے شام تک اس کے تذکرہ سے فرصت نہ ہو، آپ نے سنا ہوگا کہ پاکستان میں ایک صاحب کا اس خبر سے ہارٹ فیل ہو گیا کہ ایک کھلاڑی ۹۹ رن بنا کر آؤٹ ہو گیا اور سنچری نہ بنا سکا، میں نے بعض سفروں میں دیکھا ہے کہ دو دو تین تین گھنٹے تک مسلسل کرکٹ کی ٹیم اور اس کے کھیل پر تبصرہ ہوتا رہا، ایک منٹ کے لیے بھی موضوع نہ بدلا، انسانو! تم نے دنیا کو کلب بنایا، ٹکسال بنایا، جنگ کا میدان بنایا، مگر آدمیوں کی بستی نہ بنائی!

دل کی سچی پیاس

پہلے ہر گاؤں، ہر قصبے میں، اللہ کے ایسے بندے ہوتے تھے، جن سے دل کی پیاس بجھتی تھی، جس طرح زبان کی ایک پیاس ہوتی ہے، اسی طرح دل کی بھی پیاس ہوتی ہے، زبان کی پیاس پانی، شربت، سوڈے لیمن سے بجھتی ہے، دل کی پیاس سچی اور پاک محبت کی باتوں اور محبوبِ حقیقی کے تذکرے سے بجھتی ہے، وہ روپیہ، دولت اور نفس کی خواہشات کے ذکر سے بھڑکتی ہے، آج ہر چیز کی دکانیں ہیں، منڈیاں ہیں، بازار ہیں، لیکن دل کی دوا اور روح کی غذا نایاب ہوتی جاتی ہے، اور کہنے والے عرصہ سے کہہ رہے ہیں۔ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

آج نہ گھروں میں خدا کا ذکر ہے، نہ ریلوں میں، حتیٰ کہ مسجدوں، مندروں میں بھی اس کا ذکر فکر کم سے کم ہوتا جا رہا ہے، آج جگہ جگہ ہوا و ہوس اور نا ؤ نوش کا شور برپا ہے، رہی سہی کمی یہ سنیما پوری کر دیتے ہیں، جو حیوانی جذبات بھڑکانے کا خاص کام کرتے ہیں، روح بے قرار ہے، اللہ کا بندہ کہاں جائے؟ اگر صرف پیسہ ہی کمانا انسان کا کام ہے، اور پیٹ بھر لینا ہی اس کا فرض تھا، تو یہ دل انسان کو کیوں دیا گیا؟ دماغ کیوں عطا کیا گیا؟ ایسی بے چین اور بلند پرواز روح کیوں بخشی گئی؟ ایسی گوناگوں اور عجیب و غریب صلاحیتیں کیوں ودیعت کی گئیں؟

کسی کو انسانیت کا درد نہیں

یورپ نے انسان کو ایندھن سمجھ لیا، وہ اپنی عزت و خواہشات کے الاؤ میں انسانوں کو لکڑی کوئلہ کی طرح ڈالتا جا رہا ہے، امریکہ کی خواہش ہے کہ شمالی کوریا اور کمیونسٹ چین کو بھینٹ چڑھا دے، روس چاہتا ہے کہ قوم پرست چین کو تباہ کر کے رکھ دے، پورا یورپ چاہتا ہے کہ مشرق بعید یا مشرق وسطی جنگ کا

میدان بن جائے، کسی کو انسانیت کا درد نہیں، کسی کے دل میں انسان کا احترام نہیں، سب خدا کی مملکت کے غاصب بننا چاہتے ہیں، کوئی خدا کا نائب بننا نہیں چاہتا، کوئی اپنے کو اس مقدس وقف کا متولی نہیں سمجھتا۔

ایشیا اور افریقہ میں بھی حکومتوں کی بنیاد ہدایت و رہنمائی کے اصول، انسانوں کی فلاح و بہبود، اخلاقی اصلاح اور انسانیت کی ترقی پر نہیں، سب کی بنیاد مالی مسائل اور آمدنی کے وسائل کی ترقی و اضافہ پر ہے، ان کے نزدیک قوم کی اخلاقی حالت اور انسانی مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اس کے لیے کوئی مالی نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، اگر کسی غلط ادارہ یا کسی تفریحی صنعت سے اس کو بڑی آمدنی ہوتی ہے، اور قوم کے کسی طبقہ یا نئی نسل کو اس سے نقصان پہنچتا ہے، تو وہ کبھی اس آمدنی سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں، چاہے آئندہ نسلیں بالکل تباہ، اور اخلاق بالکل برباد ہو جائیں۔

خود کرنے کا کام

دوستو! اس وقت ایمان و اخلاق اور انسانیت کا مسئلہ نہ حکومتوں پر چھوڑا جا سکتا ہے، نہ اداروں اور تعلیم گاہوں پر، یہ بڑا وسیع اور عالمگیر مسئلہ ہے، اس کے لیے ہم سب کو کوشش کرنے کی ضرورت ہے، یاد رکھیے، جس کام کو افراد اور عوام کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اور جس کی اہمیت کا احساس جمہور اور عوام کو نہ ہو، وہ کام جتنا بھی آسان ہو عمل میں نہیں آ سکتا، اور بڑی سے بڑی حکومت بھی اس کو انجام نہیں دے سکتی، اس کے لیے عمومی اور عوامی کوشش کی ضرورت ہے، پیغمبروں نے اپنی ذات اور عام افراد کی کوشش سے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا، ہم کو آپ کو ان کے نقش قدم پر چل کر اس کی کوشش کرنی چاہیے، خود اپنی اصلاح کرنی چاہیے، اور عام اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے، اس کی کوشش کی جائے کہ

انسان اس دنیا کو مقدس وقف اور اپنے کو ایک ذمہ دار متولی سمجھنے لگے، وہ اپنے کو اس دنیا میں خدا کی نیابت و خلافت کا اہل ثابت کرے، اور اخلاق خداوندی کے ساتھ خدا کی مخلوق کے ساتھ برتاؤ کرے، یہی اصلاح کا طریقہ ہے، اور اسی میں انسانیت اور دنیا کی نجات ہے۔(۱)

(۱) بنتھرا روڈ، ضلع بلیا کے ایک مخلوط اجتماع کی ایک اہم تقریر، جس میں ہندو مسلم حضرات کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ ماخوذ از "مقام انسانیت" (صفحہ ۱۹ تا ۳۲)۔

ملک کی حقیقی آزادی

دوستو اور بھائیو!

ہم اور آپ جس جگہ جمع ہیں، یہ پارک ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، جنگ آزادی کا مؤرخ اس کو فراموش نہیں کرسکتا، جب تحریک خلافت اور تحریک آزادی کا عروج تھا تو یہ پارک بڑے بڑے سیاسی جلسوں کا مرکز تھا، میری آنکھوں نے یہاں بڑے بڑے تاریخی مناظر دیکھے ہیں، میں نے یہاں گاندھی جی اور بڑے بڑے لیڈروں کی تقریریں سنیں، اور سول نافرمانی کے دور میں یہاں انگریزی فوج کا تسلط بھی دیکھا، جس زمانہ میں ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھا گیا تھا، اس وقت بڑے بڑے سمجھ دار لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہوگا، جو لوگ ۲۰-۳۰ سال پہلے یقین دلاتے تھے کہ آزادی ضرور حاصل ہوگی، ان کی بات پر تعلیم یافتہ طبقہ کو یقین نہیں آتا تھا، ۱۹۴۷ء کے فیصلے تک ایسے لوگ اس ملک میں موجود تھے، جو ان باتوں پر ہنستے تھے، اور کہتے تھے کہ برطانیہ اس ملک سے جو اس کے تاج کا کوہ نور ہے، اور جس سے اس کی دنیا میں ساکھ قائم ہے، کس طرح دستبردار ہوسکتا ہے؟ لیکن یہ انہونی بات ہوکر رہی، واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے، صرف انسانوں کا فیصلہ اور عزم شرط ہے۔

جس طرح آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ ملک کو انگریزی غلامی سے آزاد کرانا ہے، اور اپنے رہنماؤں کی قیادت میں جدو جہد کی اور یہ خواب پورا ہوکر رہا، اسی طرح اگر آپ اس سے بڑھ کر کوئی منصوبہ بناتے اور اس کے لیے بھی قربانیاں دیتے تو وہ بھی پورا ہوسکتا تھا، مگر اس وقت آزادی ہی سب سے بلند اور آخری چیز معلوم ہوتی تھی، یقیناً

آزادی بڑی نعمت اور زندگی کی اہم ترین ضرورت ہے، اور اس کے لیے جو قربانیاں کی جائیں وہ بجا ہیں، ہم کو ان رہنماؤں کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے، جنھوں نے آزادی کی جنگ لڑی اور ملک کو آزاد کرایا، لیکن میں نہایت صفائی سے عرض کروں گا، ہماری یہی طاقت اور فیصلہ کی قوت جس کی بدولت ہمارے ملک سے غلامی کی لعنت ختم ہوئی، اگر اس سے زیادہ حقیقی اور مکمل آزادی کے حصول اور انسانیت کی تعمیر اور ترقی اور انسان کو انسان بنانے کے کام پر صرف کی جاتی تو یہ دنیا کا سب سے اہم کام اور مشکلات و مسائل کا اصلی اور مستقل حل ہوتا۔

آزادی کے آگے

میں آزادی کی تحریک کی تحقیر اور ناشکری نہیں کرتا، مگر یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ دنیا کا سب سے عظیم الشان کام اور انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انسان حقیقی انسان بن جائے، اس کے بغیر آزادی اور خود مختاری کے بعد بھی زندگی کا حقیقی لطف اور مسرت اور صحیح خوشحالی حاصل نہیں ہوسکتی، اور انتشار، کش مکش اور بے اطمینانی ختم نہیں ہوسکتی، مصیبت، پریشانی اور ذلت ہمیشہ دوسروں ہی کی شکل میں نہیں آتی، وہ کبھی اپنے اندر سے بھی ابھرتی ہے، ظلم وستم اور لوٹ کھسوٹ کے لیے پردیسی ہونا شرط نہیں، ایک ملک کے رہنے والے خود اپنے ملک کے اندر بطور خود بھی یہ خدمت انجام دینے لگتے ہیں، میں غلامی سے نفرت ہرگز کم نہیں کرنا چاہتا، لیکن ذرا جذبات وتعصبات سے الگ ہوکر سوچیے کہ ہم انگریز کو اپنا دشمن کیوں سمجھتے تھے؟ اور غلامی سے ہمیں کیوں نفرت تھی؟ اس لیے کہ ہمیں زندگی کا حقیقی لطف میسر نہ تھا، ہم کو سکون و اطمینان حاصل نہ تھا، ہم کو ہماری ضروریات زندگی آسانی سے میسر نہیں ہوتی تھیں، ہم ہمدردی، خلوص ومحبت اور تعاون سے محروم تھے، جس کے بغیر زندگی تلخ اور یہ دنیا ایک جیل خانہ ہے، دوستو! فرض کرو، اگر باہر کی غلامی چلی گئی، لیکن ہم کو خود ایک دوسرے کو غلام بنانے کا چسکا پڑ گیا، ہم کو خود ایک دوسرے پر ظلم

کرنے میں مزہ آنے لگا، ہم بھی ایک دوسرے سے بیگانہ واجنبی ہیں، ہمدردی اور تعاون سے ناآشنا ہیں، ایک شہری دوسرے شہری کے ساتھ وہی برتاؤ کرنے پر آمادہ ہے اور موقع کا منتظر ہے جو ایک فاتح ایک غلام کے ساتھ اور ایک دشمن دوسرے دشمن کے ساتھ کرتا ہے، میں اپنے فاضل سامان میں آپ کی ضروریات زندگی کا بھی اضافہ کرنے پر مصر اور بضد ہوں، ملک میں اس ذہنیت کا رواج زور پکڑ رہا ہے، جس کو قرآن نے ایک قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کے پاس دو فریق مقدمہ لے کر آئے، ایک نے کہا کہ اے پیغمبر خدا اور اے بادشاہ وقت! ہمارا انصاف کیجیے، میرے اس بھائی کے پاس ۹۹ بھیڑیں ہیں، اور میرے پاس لے دے کر صرف ایک، مگر یہ ظالم کہتا ہے کہ اپنی ایک بھیڑ بھی دے دو تاکہ میری سو کی گنتی پوری ہو جائے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر کسی ملک کے شہریوں کی یہی ذہنیت بنتی چلی جائے تو کیا اس ملک کو آزادی کی حقیقی دولت حاصل ہے؟ اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ملک کا ہر شہری وہی پارٹ ادا کرنا چاہتا ہے، جو دوسرے ملک کی ایک قوم اس ملک کے باشندوں کے ساتھ ادا کرتی تھی؟ اور کیا وہ ساری تکلیفیں کسی صورت میں موجود نہیں؟ یہ سب اس لیے کہ ملک کی آزادی کے لیے جان توڑ کوشش کی گئی اور ملک آزاد ہو گیا، لیکن انسان کے دل ودماغ اور اس کی روح کی آزادی کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی، اور وہ بدستور غلام رہے، ملک سے ظالم کو نکال دیا گیا، لیکن دل سے ظلم کی خواہش کو نہیں نکالا گیا، وہ بدستور موجود ہے، اور اپنا کام کر رہی ہے۔

قلب کی روشنی

پیغمبروں نے خدا کی دی ہوئی تمام طاقت اور اپنی ساری توجہ حقیقی اور مکمل انسان کے بنانے پر صرف کی، انھوں نے صرف ملک کی آزادی کو اپنا مطمحِ نظر نہیں بنایا، بلکہ ان

احساسات کو پیدا کرنے پر، اس عقیدے اور ایمان کو قلب و دماغ میں جاگزیں کرنے اور ان اخلاق کو پیدا کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کی جن کے ساتھ نہ باہر کی غلامی کی گنجائش تھی، نہ اندر کی غلامی کی، جن کی موجودگی میں آدمی نہ دوسروں کا ظلم سہہ سکتا تھا، نہ دوسروں پر ظلم کرنا گوارا کر سکتا تھا، جن کی بدولت نہ دوسروں کا شکار ہو سکتا تھا، نہ غیروں کا شکاری بن سکتا تھا، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مثال لیجیے، آپ کے گرد جانبازوں اور سرفروشوں کی جو جماعت اکٹھا ہو گئی تھی، اس کے ذریعہ سے آپ ہر قسم کا کام کرا سکتے تھے، لیکن آپ نے سیرت و کردار کی تعمیر میں اپنی ساری قوت صرف کی، آپ نے یقیناً انسانیت کو وہ ایجادات و ذرائع و آلات نہیں عطا فرمائے جو یورپ کے سائنس دانوں نے اس اخیر دور میں دیے، لیکن آپ نے ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ جیسے انسان عطا کیے جو انسانیت کے حق میں رحمت و برکت ثابت ہوئے، آج بھی اگر انسانیت سے سوال کیا جائے کہ اس کو ابوبکرؓ جیسا انسان حکومت و انتظام کے لیے چاہیے یا کوئی بہتر سے بہتر ایجاد؟ تو یقیناً اس کا جواب یہی ہوگا کہ اس کو ابوبکرؓ جیسا انسان چاہیے، اس لیے کہ اس نے ان ایجادوں کا خوب تجربہ کر لیا ہے کہ حقیقی انسانوں کی غیر موجودگی میں وہ دنیا کے لیے ایک مصیبت اور پیغام ہلاکت بن گئی ہیں۔

شاہ کلید

دوستو! ہم نے بار بار کہا ہے، اور ہمیشہ کہیں گے، کہ سب سے اہم اور مقدم کام یہ ہے کہ انسان کو حقیقی معنی میں انسان بنایا جائے، اس کے اندر سے گناہ اور ظلم کی خواہش ختم ہو، نیکی اور خدمت کا جذبہ پیدا ہو، انسانی زندگی کے رشتہ میں ہزار گرہیں پڑتی ہیں، انسانی زندگی کے ہزاروں مشکلات اور مسائل ہیں، ان پر بھاری بھاری تالے پڑے ہوئے ہیں، ان سب قفلوں کے کھولنے کی ایک ہی کنجی ہے، اس کو شاہ کلید کہیے یا ماسٹر کی (Master Key) یہ کنجی خدا کے پیغمبروں کو ملتی ہے، اور جس کو ملتی ہے، اسی کے ذریعہ ملتی ہے، یہ کنجی کیا

ہے؟ خدا کی ہستی کا یقین اور اس کا خوف، اس کنجی سے انسانی زندگی کا ہر قفل آسانی سے کھل جاتا ہے، اور اس کی گرہیں سلجھتی چلی جاتی ہیں، یوں سمجھئے کہ پیغمبروں کا ہاتھ بجلی کے بٹن پر ہوتا ہے، انھوں نے سوئچ (Switch) دبایا اور سارا گھر روشن ہو گیا، جس کا ہاتھ اس سوئچ تک نہیں پہنچتا وہ کسی طرح روشنی نہیں لاسکتا۔

سیرت سازی اور اخلاقی اصلاح کے بغیر کوئی منصوبہ کامیاب نہیں

آج ہر ملک کی تعمیر و ترقی اور جدید تنظیم کے لئے نئے نئے پلان اور منصوبے (Projects) بنائے جا رہے ہیں، ہمارے ملک میں بھی یہ کام تیزی سے ہو رہا ہے، خدا ان منصوبوں کو کامیاب کرے، لیکن یہ منصوبے ہماری نگاہ میں ابھی تک ادھورے اور ناقص ہیں، ان میں انسانیت کی تعمیر، سیرت سازی اور اخلاقی اصلاح کا کوئی خانہ نہیں، ہمارا یقین ہے کہ جب تک طبیعتوں میں حرص و ہوس کی آگ سلگ رہی ہے، دولت کا بھوت سوار ہے، انسان صرف روپیہ پیدا کرنے اور اس سے عیش کرنے ہی کو زندگی کا مقصد سمجھتا ہے، اس وقت تک کوئی نقشہ اور کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکتا، جن ملکوں میں یہ منصوبے پورے طور پر کامیاب ہو چکے ہیں اور وہ ملک عرصہ ہوا ان منزلوں کو طے کر چکے ہیں، کیا ان کو حقیقی امن و اطمینان حاصل ہے؟ کیا وہاں جرائم نہیں ہوتے؟ جرائم میں تو وہ ملک ہمارے ملک سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں، وہاں دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں، بڑے بڑے دولت مندوں اور کارخانہ داروں کو راستہ چلتے اڑا لیا جاتا ہے، اور پھر ان کے عزیزوں کو دھمکا کر بڑی بڑی رقمیں وصول کی جاتی ہیں، آج ان ملکوں کا اخلاقی زوال اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ان کو اپنی ہستی قائم رکھنا بھی مشکل ہو رہا ہے، ایک قوم پرستی اور وطنیت کا شور ہے، جو ان کا تھامے ہوئے ہے، پھر بھی ان کا زوال کچھ دور نہیں اور اقبال کا یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں۔

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھیے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

کردار کی ضرورت

حضرات! یہ دولت ستانی، یہ مجرمانہ ذہنیت، یہ ظلم وستم کی خواہش کسی مذہب کی قائل اور کسی فرقہ کی حامی نہیں، چور و مجرم کا مذہب نہ ہندو ہے نہ مسلمان، جس کے اندر یہ سیرت اور کیریکٹر پیدا ہو جائے، اس کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ جس کا گلا کاٹ رہا ہے، وہ کس مذہب وملت کا ہے، وہ تو بھائی کو بھائی نہیں دیکھتا، کوئی حادثہ اس سے بڑھ کر نہیں اور کوئی خطرہ اس سے زیادہ سنگین نہیں کہ خدا کے نام پر اس ملک میں کوئی آواز بلند کرنے والا نہ ہو، کہیں کوئی اخلاق کی اصلاح اور حقیقی انسانیت کی دعوت اور تحریک نہ ہو، آج ہمارے ادب، ہماری صحافت اور ہماری سوسائٹی پر یا تجارت کا تسلط ہے، یا سیاست کا، ملک کے بڑے بڑے اخبارات اٹھا کر پڑھ لیجیے سوائے ان دو موضوعوں کے کوئی چیز ایسی نہ ملے گی جس کا تعلق روحانیت یا اخلاق یا انسانیت سے ہو، اس بارے میں تمام سیاسی پارٹیوں اور تحریکوں کا ایک ہی مزاج ہے، کسی کو اس صورت حال سے اختلاف اور جنگ نہیں، ان کی ساری کشمکش اس لیے ہے کہ ان کو قیادت اور لیڈر شپ (Leadership) حاصل ہو، اور جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب ہماری رہنمائی اور نگرانی میں ہو۔

اخلاقی زوال

اخلاقی زوال بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اب انسان کی انسانیت کی تذلیل سے تفریح ہوتی ہے، بلکہ مذاق اتنا بگڑ گیا ہے کہ انسانیت جتنی پست سطح پر اترے اتنی ہی آسودگی اور تفریح ہوتی ہے، یہ فلم اور پکچر، یہ ناول اور افسانے، یہ عریاں تصویریں اور فحش گانے کیوں آپ کی تفریح کا سامان ہیں؟ کیا ان میں انسانیت کو ذلیل شکل میں نہیں دکھلایا جاتا؟ کیا یہ آدم کے بیٹوں اور حوا کی بیٹیوں کو جو آپ کے بھائی اور بہنیں ہیں ایسی شکل میں نہیں پیش کرتی، جو انسانیت کے لیے باعث ننگ و عار ہیں؟ کیا آپ کو ان تصویروں اور کھیلوں، ان فلموں اور ناولوں میں انسانیت کی ذلت اور رسوائی نظر نہیں آتی؟ پھر آپ کی

طبیعت میں کیوں اشتعال اور نفرت پیدا نہیں ہوتی ؟ آپ ان کو کس طرح گوارا کرتے ہیں؟ جب کوئی سوسائٹی اخلاقی حیثیت سے معیاری ہوتی ہے تو اس کا کوئی فرد کسی فرد کی ذلت برداشت کرنا تو الگ رہا، اس کے متعلق کسی بداخلاقی کے واقعہ کا سننا بھی گوارا نہیں کرتا، قرآن مجید میں ایک غلط الزام کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ''تم نے سنتے ہی کیوں نہ اس کی تردید کی اور صاف کہہ دیا کہ محض ایک طوفان اور اتہام ہے، تم نے اپنے متعلق نیک گمان کیوں نہیں کیا، اور اپنے اوپر اعتماد سے کام نہیں لیا۔'' یہ ہے اس سوسائٹی کی بات جو آئیڈیل (Ideal) سوسائٹی کہلانے کی مستحق ہے، جس میں ہر فرد دوسرے فرد کا آئینہ ہوتا ہے، اس کا مقابلہ اس گری ہوئی سوسائٹی سے کیجیے جس کے کچھ افراد دوسرے افراد کی اخلاقی گراوٹ اور خلاف شرافت وانسانیت حرکات سے لذت اور تفریح حاصل کرتے ہیں، ایک انسان اپنے جسم کو عریاں کرتا ہے، ہوا و ہوس کا شکار بنتا ہے، اپنی عزت اور اپنے ضمیر کو فروخت کرتا ہے، اور سیکڑوں اور ہزاروں آدمی اس کا تماشہ دیکھتے اور تفریح حاصل کرتے ہیں، اخلاقی گراوٹ اور بے حمیتی کی اس سے زیادہ عبرت ناک مثال اور کیا ہوسکتی ہے، یہی وہ حالات اور آثار ہیں جن سے خطرہ ہوتا ہے کہ یہ ملک اپنی تمام مادی ترقیوں اور ظاہری خوش حالیوں کے باوجود کہیں زوال کا شکار نہ ہوجائے، یہ بداخلاقیاں، گناہ اور تعیشات کا رجحان بیماریوں اور وباؤں سے کہیں زیادہ خطرناک ہے، آپ کسی ایک گذشتہ قوم کا نام بتلا دیجیے جس کے متعلق تاریخ میں یہ درج ہو کہ وہ پوری کی پوری قوم فلاں بیماری یا وبا کی نذر ہو کر بالکل فنا ہوگئی، لیکن میں آپ کو ایسی بیسیوں قوموں کا نام بتلا سکتا ہوں جو بداخلاقیوں کا شکار ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔

انسانیت

حضرات! آپ نے اس ملک کی آزادی کے لیے جد و جہد کی، اس کے لیے قربانیاں پیش کیں اور اس کے لیے وہ راستہ اختیار کیا، جس کا آپ کے رہنماؤں نے مشورہ

دیا، وہ کام اتنا ہی تھا کہ یہ ملک آزاد ہو جائے، چنانچہ یہ ملک آزاد ہو گیا، اب انسانوں میں صحیح انسانیت پیدا کرنے کے لیے از سر نو جد وجہد کرنی پڑے گی، اس کا یہی ایک راستہ ہے، اور وہ وہی راستہ ہے، جو خدا کے پیغمبروں نے بتلایا اور اس پر چل کر ان کے ماننے والے منزل مقصود کو پہنچے اور انھوں نے دنیا میں حقیقی انسانیت کا نمونہ پیش کیا، اس کا سرا وہی ایمان ویقین اور خدا کا خوف ہے، یہ سچی خدا پرستی اور یہ زندہ یقین اور یہ ضمیر کی بیداری پیغمبروں کے علاوہ کسی اور جگہ سے دستیاب نہیں ہو سکتی، اس کا خزانہ وہیں ہے اور ہم کو اس خزانے سے حاصل کرنے میں شرم اور عار محسوس نہیں ہونا چاہیے، اگر آج اس کے حصول اور اس کی دعوت واشاعت کے لیے وہی جد وجہد شروع ہو، ملک کی آزادی کے لیے جو قربانیاں کی گئی تھیں، وہی قربانیاں اس راستہ میں ہوں، بدیشی حکومت کو نکالنے کے لیے جو تکلیفیں برداشت کی گئی تھیں وہی سب تکلیفیں برداشت کی جائیں تو ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہو، حقیقی امن واطمینان حاصل ہو، ہر طرح کی غلامیوں کا سلسلہ بند ہو، اور ملک کو حقیقی آزادی اور زندگی کا حقیقی لطف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔(۱)

---

(۱) ۲۲ فروری ۱۹۵۵ء کو امین الدولہ پارک (لکھنؤ) میں مرکز دعوت اصلاح وتبلیغ کے زیر اہتمام منعقد ایک جلسۂ عام میں کی گئی تقریر، جس میں اندازاً ۶-۷ ہزار کی تعداد میں ہر مذہب وخیال کے لوگوں نے شرکت کی۔ ماخوذ از ''مقام انسانیت'' (صفحہ ۴۷ تا ۵۸)۔

موجودہ تہذیب کی ناکامی
ذرائع ومقاصد کا عدم توازن

مجھے آپ بھائیوں سے جو کچھ عرض کرنا ہے، اس کے لیے میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ توجہ اور غور سے سنیں، اگر آپ کے ذہن اس کو قبول کریں تو اس کو آپ دوسروں تک بھی پہنچائیں، ہم اور ہمارے احباب اور رفقاء آپ کے شہر میں آئے، آپ کو یہ پوچھنے کا حق ہے کہ آپ نے یہ زحمت کیوں گوارا کی؟ اور آپ کو کون سا احساس یہاں لایا؟ آپ نے یہ تو اندازہ کیا ہوگا کہ کوئی بات تو ہے کہ یہ قافلہ شہر شہر پھر رہا ہے، ہم آپ کے سامنے اپنا درد دل پیش کرتے ہیں، اور آپ کو اس درد میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔

ذرائع کی آسانی اور فراوانی

دوستو اور بھائیو! یہ زمانہ بعض حیثیتوں سے بہت ممتاز ہے، کام کرنے کے ذرائع جہاں تک اس زمانہ میں مہیا ہو گئے ہیں، اتنے کبھی مہیا نہیں ہوئے تھے، میں تاریخ کا ایک طالب علم ہوں، میں جانتا ہوں کہ اتنے ذرائع کبھی انسان کے پاس اس سے پہلے جمع نہیں ہوئے تھے، ذرائع کی بہتات اس دور کی خصوصیت ہے، ذرائع آج زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر ہیں، ہم لوگ لکھنؤ سے چند گھنٹوں میں سفر طے کر کے پہنچ گئے، اس سے بھی تیز رفتار گاڑی سے یہ سفر کیا جا سکتا ہے، لوگ ہوائی جہازوں سے بھی یہاں آ سکتے ہیں، آج سے صرف ۷۰-۸۰ برس پہلے لکھنؤ سے کوئی بنارس آنا چاہتا، تو آپ سوچیے کہ وہ کیا ذرائع

اختیار کرتا اور کتنی مدت میں پہنچتا؟

یہ تو سفر کرنے کا معاملہ ہے، ایک زمانہ تھا کہ آدمی اپنے دور افتادہ احباب اور عزیزوں کی خیریت معلوم کرنے کو ترستا تھا، مگر آج دور دراز ممالک کے لوگوں کی آواز ہم گھر بیٹھے سن سکتے ہیں، اور اس طرح کہ گویا وہ ہم سے بات کر رہے ہیں، آج چند دن میں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خط پہنچ جاتا ہے، اور تار اس سے بھی پہلے پہنچتا ہے، ایک زمانہ وہ تھا کہ عام حالات میں جو کوئی پردیس جاتا تو واپسی مشکوک تھی، اور کہا سنا معاف کرا کے جانا پڑتا تھا، اگر کوئی برسوں میں آتا اور خیریت بتلاتا تو خدا کا شکر ادا کرتا، ورنہ کوئی خیر خبر نہیں ملتی تھی، لیکن آج اگر کوئی طول طویل سفر اختیار کرتا ہے، تو وہ ہر جگہ سے اپنی خیریت بتلا سکتا ہے، اور بہت آسانی سے بہت تھوڑے عرصہ میں واپس آجاتا ہے، آج حالت یہ ہے کہ آپ لندن کے گھنٹے کی آواز یہاں بیٹھے بیٹھے سن سکتے ہیں، نیویارک میں کوئی آدمی بیان دیتا ہے، یا تقریر کرتا ہے تو یہاں آپ اس کی زبان سے سنتے ہیں، آج سے ۵۰ برس پہلے کوئی ایسی بات کہتا تو اس کا سمجھنا بھی مشکل ہوتا، لیکن آج اگر ان ایجادات کے بارے میں کوئی شبہہ کرے تو بچے بھی اس پر ہنسیں، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، وائرلیس، ریڈیو اور مختلف قسم کی خوردبینوں کو آپ ملاحظہ کیجیے کہ جدید علمی تحقیقات اور سائنس نے ہم کو کیسے کیسے ذرائع بخشے ہیں، ہمارے دل میں بار بار یہ حسرت اور تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ اگر کبھی اس زمانہ میں نیک بننے کی خواہش، خدا پرست بننے کی خواہش، رحم دلی، انسانی ہمدردی اور ایک دوسرے سے محبت بھی ہوتی، اور ان ذرائع سے صحیح کام لیا جاتا تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جاتی، رہ رہ کر ہمارے دل میں ایک ہوک اور درد اٹھتا ہے کہ کام کرنے کے ذرائع کی تو اس قدر بہتات، مگر ان ذرائع سے ٹھیک ٹھیک کام لینے والوں کا ایسا کال، آپ کو اب ذرائع تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، ذرائع خود آپ کو تلاش کرتے ہیں، آج سواریاں خود مسافروں کو تلاش کرتی ہیں، اور آپس میں مقابلہ کرتی ہیں، آج ریلوے کی طرف سے ٹائم ٹیبل شائع ہوتے ہیں، سفر کی ترغیب دینے کے لیے صحت افزا مقامات

اور تاریخی شہروں کی تصویریں اور مناظر شائع کیے جاتے ہیں تاکہ سفر کا شوق ہو، ہوائی جہاز کی کمپنیاں اشتہار دیتی ہیں، اسٹیشن پر گاڑی سے اترتے ہی ہوٹل والوں سے سابقہ پڑتا ہے، بعض دفعہ تو وہ جھاڑ کی طرح ساتھ لگ جاتے ہیں، اور ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے، ایک زمانہ تھا کہ مسافر سرائے ڈھونڈتا پھرتا تھا، اور بھٹیارے یا بھٹیارن کی تلاش کرنی پڑتی تھی، آج معاملہ برعکس ہے۔

مقاصد اور نیک خواہشات کا فقدان

لیکن جس تیزی سے ذرائع نے ترقی کی ہے، ہمارے اخلاق اور آدمیت نے ترقی نہیں کی، ایک انسان کو یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ پہلے آدمی بھلائی کرنا چاہتا تھا، اس کے پاس ذرائع نہ تھے، مگر اب ذرائع ہیں، تو بھلائی کی خواہش دلوں سے جاتی رہی، میں اس کی ایک واضح مثال دوں، پہلے ایک غریب گھرانے کا آدمی پردیس کمانے جاتا تھا، وہ جو کچھ کماتا تھا، اس کا گھر بھیجنا مشکل تھا، یا تو وہ خود جائے یا قسمت سے کوئی معتبر جانے والا مل جائے، وہ تڑپ کے رہ جاتا تھا، اس کو اپنے گھر والوں کی تکلیف، بچوں کی بھوک اور ان کا رونا یاد آتا تھا، اور کچھ نہیں کر سکتا تھا، نہ ڈاک خانہ تھا، نہ حمل ونقل کی آسانیاں، مگر اب شہر شہر اور قصبہ قصبہ ڈاک خانے کھلے ہیں، روپیہ منی آرڈر کے ذریعہ بھیجا جا سکتا ہے، اور تار کے ذریعہ بھی، لیکن کمانے والے کے دل میں روپیہ بھیجنے کی خواہش، گھر والوں کی تکلیف اور گاؤں والوں کی غربت کا احساس ہی نہیں، سنیما، تفریح گاہوں، کھیل تماشوں، اور ہوٹل اور ریسٹران سے کچھ بچتا ہی نہیں کہ وہ گھر بھیجے، ڈاک خانہ کا تو یہ کام ہے کہ اگر کوئی روپیہ بھیجنا چاہے تو اس کو پہنچا دے، لیکن اگر کوئی بھیجنا ہی نہ چاہے تو ڈاک خانہ کچھ نہیں کر سکتا، اس کا کام اخلاقی تعلیم یا نیکی کی ترغیب نہیں ہے، پہلے لوگ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے بھی مشکل سے رکھتے تھے، اور سب غریب گھر والوں کو اور گاؤں کے ضرورت مندوں کو بھیج دینا چاہتے تھے، مگر آج بھیجنے اور مدد کرنے کے تو سب ذرائع موجود ہیں، آدمی کے اندر غریبوں

کی مدد کا جذبہ نہیں، مدد کی خواہش فنا ہو چکی، ہمارے تمدن میں اس کا ذکر ہی نہیں، اب یہ ذرائع کیا کارآمد ہو سکتے ہیں؟

ذرائع اور آسانیاں نیک خواہشات کی خانہ پری نہیں کرسکتیں

ذرائع، جذبات، اچھی خواہشات اور نیک ارادوں کی خانہ پری نہیں کر سکتے، آج منی آرڈر ہے، تار ہے، آمدورفت آسان ہے، دولت کی افراط ہے، مگر اس کا کیا علاج کہ غریبوں کی مدد کا جذبہ اور طبیعت میں انسانوں کی خدمت کا تقاضا نہیں؟ دنیا کا کون سا ادارہ اس خواہش کو پیدا کرسکتا ہے، اور ایسی حالت میں ذرائع کیا مدد کر سکتے ہیں؟

میں اس کی ایک دوسری مثال دیتا ہوں، آپ پرانی کتابیں اٹھا کر دیکھیے، بڑے بڑے اللہ کے نیک بندے یہ آرزو لیے دنیا سے چلے گئے کہ اللہ ان کو حج نصیب کرے، انھوں نے فرط محبت اور شوق میں سیکڑوں اشعار کہے اور بیسیوں مضمون لکھے، لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، کیوں کہ ان کے پاس اتنا پیسہ تھا، نہ سفر کی یہ سہولتیں موجود تھیں، فرض کیجیے کہ روپیہ بھی ہو اور سفر کی سب آسانیاں بھی، لیکن حج کی خواہش اور شوق نہ ہو، تو بتائیے کہ یہ ذرائع کیا کر سکتے ہیں؟ پہلے کاشی، گیا اور متھرا کی یاترا کے لیے لوگ سیکڑوں میل سے پیدل آتے تھے، اور سفر کی تکالیف اٹھاتے تھے، فرض کیجیے آج سفر کی سب آسانیاں ہیں، تیز رفتار سواریاں ہیں، مگر یاترا کا شوق اور جذبہ نہیں ہے، تو یہ ذرائع کیا کر سکتے ہیں؟

ذرائع سے پہلے ان سے کام لینے والے چاہئیں

پیغمبروں کو یہ معلوم تھا کہ ذرائع سے پہلے ان سے کام لینے والوں کی ضرورت ہے، اللہ نے انھیں عقل ایمانی اور نور نبوت عطا کیا تھا، انھوں نے ذرائع پیدا کرنے سے پہلے ذرائع سے ٹھیک ٹھیک کام لینے والے پیدا کیے، سواریاں مہیا کرنے پہلے ان سے فائدہ اٹھانے والے اور نیک مقاصد سے سفر کرنے والے پیدا کیے، پیسہ کمانے سے پہلے اس کو صحیح مصرف پر صرف کرنے والے اور صحیح طریقہ سے استعمال کرنے والے پیدا کیے، ذرائع

پیدا کرنے سے پہلے اپنی قوتوں اور خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتوں کا استعمال سکھایا، انھوں نے انسان کے اندر اچھی خواہشیں پیدا کیں، اور اچھی خواہشات یوں ہی نہیں پیدا ہوتیں، وہ یقین اور عقیدے سے پیدا ہوتی ہیں، یقین خواہش پیدا کرتا ہے، خواہش عمل کا ارادہ پیدا کرتی ہے، اور عمل ذرائع سے کام لیتا ہے، ذرائع اور انسانی کوششوں کے نتائج ہمیشہ انسان کے ارادہ کے تابع رہے، نیک خواہشات اس زندگی کی سب سے بڑی طاقت اور دولت ہے، مگر دنیا کے بڑے بڑے فلسفی لیڈر اور سائنس داں اس نکتہ کے سمجھنے سے قاصر رہے، یہ صرف خدا کی رہنمائی اور پیغمبروں کی فراست تھی کہ انھوں نے پہلے نیک خواہش پیدا کی، انسان کو نیک بننے، دوسروں سے ہمدردی کرنے اور نیکی کو پسند کرنے والا بنایا، ذرائع ان کے قدموں کے نیچے تھے، اور ان کی خواہشات کے پیچھے پیچھے، ان کا ذہن صحیح رہبری سے نہیں ہٹتا تھا، وہ انسانوں کے دل بناتے تھے، وہ انسانوں کے دماغ ڈھالتے تھے، اللہ کے پیغمبروں نے دنیا کو سائنس نہیں دی، انسان دیے اور انسان ہی اس دنیا کا حاصل ہے۔

پیغمبروں نے انسان تیار کیے

پیغمبروں نے وہ انسان تیار کیے جو اپنے نفس پر قابو رکھتے تھے، اور ذرائع سے بجائے اپنی خداہشات کی تکمیل کا کام لینے کے انسانیت کی خدمت کا کام لیتے تھے، ان میں سے بعض ایسے تھے جن کو وہ ذرائع حاصل تھے جن سے وہ دنیا کا بڑے سے بڑا عیش کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے نہیں کیا، وہ شاہانہ زندگی گزار سکتے تھے، لیکن انھوں نے زہد و قناعت کی زندگی گزاری، حضرت عمرؓ کو وہ وسائل بھی حاصل تھے، جن سے شہنشاہ ایران نے وہ داد عیش دی جو دنیا کے کم بادشاہوں نے دی، حضرت عمرؓ کے قدموں کے نیچے روم کی پوری سلطنت تھی، اور ایران کا پورا ملک تھا، مصر اور عراق جیسے پُر وسائل اور زرخیز ممالک ان کے قبضہ میں تھے، ہندوستان کے قریب تک ان کی فوجیں آ چکی تھیں، ایشائے کوچک کے بعض علاقے ان کے قبضہ میں آ چکے تھے، ایسا شخص اگر عیش کرنا چاہتا تو اس کو کیا کمی تھی؟ مگر انھوں نے اس عظیم سلطنت اور ان کثیر وسائل سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا، ان کی سادہ

زندگی کا تو یہ حال تھا کہ انھوں نے قحط کے زمانہ میں گھی تک کا استعمال چھوڑ دیا تھا، اور تیل کھاتے کھاتے ان کا سرخ و سپید رنگ سانولا پڑ گیا تھا، انھوں نے اپنے اوپر اتنی تنگی کی تھی کہ لوگ کہتے تھے کہ اگر یہ قحط جلدی ختم نہ ہوا تو عمرؓ بچتے نظر نہیں آتے۔

انھیں کے ہم نام عمر بن عبدالعزیز اس سے بھی بڑی سلطنت کے مالک تھے، ان کا حال یہ تھا کہ حکومت کے خزانے سے سردیوں میں عام مسلمانوں کے لیے جو پانی گرم ہوتا تھا، اس سے غسل کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، ایک رات آپ حکومت کا کام کر رہے تھے، ایک شخص آیا اور اس نے آپ کی مزاج پرسی کی اور آپ کے ذاتی حالات پر گفتگو کرنے لگا، آپ نے چراغ گل کر دیا، جس میں بیت المال کا تیل خرچ ہو رہا تھا، تاکہ اس گفتگو میں جو حکومت کے کام سے غیر متعلق تھی، حکومت کا تیل خرچ نہ ہو، اگر وہ عیش کرنے پر آتے تو تمام دنیا کے عیش پرست مات ہو جاتے کیوں کہ ہر طرح کے وسائل کے وہ مالک تھے، اور اس وقت کی متمدن دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمراں تھے، یہ رسول اللہ (ﷺ) کی تعلیم تھی، کہ ان ذرائع کے باوجود ان کی زاہدانہ زندگی میں کچھ فرق نہ آیا۔

یورپ کی بے بسی مقاصد سے محرومی

دوستو اور بھائیو! یورپ کی آج سب سے بڑی کمزوری اور بے بسی ہے کہ اس کے پاس وسائل اور ذرائع کا خزانہ موجود ہے، لیکن نیک خواہشات اور نیک ارادوں کا فقدان ہے، وہ ایک طرف وسائل اور ذرائع میں قارون ہے، دوسری طرف نیک مقاصد میں محض مفلس اور قلاش! اس نے کائنات کے راز منکشف کیے اور طبعی طاقتوں کو اپنا غلام بنایا، اس نے سمندروں اور فضاؤں پر فرمانروائی حاصل کی، لیکن وہ اپنی خواہشات اور نفس پر قابو نہ حاصل کر سکا، اس نے کائنات کے عقدے حل کیے، لیکن اپنی زندگی کی پہیلی نہ بوجھ سکا، اس نے منتشر اجزا اور طبعی طاقتوں میں نظم و ترتیب قائم کی، اور اس نے اس مادی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا، لیکن وہ اپنی زندگی کا انتشار دور نہ کر سکا۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کا نہ سکا

کاش اس کے پاس اتنے عظیم وسائل نہ ہوتے، لیکن نیک خواہش اور انسانیت کی خدمت کا سچا جذبہ ہوتا!!

وسائل باعثِ ہلاکت کیوں؟

ذہن کی کجی اور نیت کی خرابی نے ان وسائل کو انسانیت کے لیے حد درجہ خطرناک بنا دیا ہے، ایک شخص جس کا دل بے رحم اور ظالم ہے، اگر اس کے پاس تیز چھری ہے تو وہ زیادہ نقصان پہنچائے گا، اور کند چھری ہے، تو کم نقصان پہنچائے گا، تمدن نے ترقی کی لیکن انسان کی سیرت نے ترقی نہ کی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نئے وسائل انسانیت کے لیے عذاب جان بن گئے، تیز رفتار سواریوں نے ظلم کی رفتار تیز کردی، اور ظالموں کو چشم زدن میں ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچا دیا، آج سے پہلے ظالم بیل گاڑیوں پر بیٹھ کر جاتے تھے، اور ظلم کرتے تھے، چوں کہ پہنچنے میں جتنی دیر لگتی تھی، ظلم میں اتنی ہی تاخیر ہوتی تھی، اور کمزوروں کو سانس لینے اور کچھ دن آرام سے سونے کا موقع ملتا تھا، زمانے نے ترقی کی اور نئے دور کے ظالم تیز رفتار سے تیز رفتار سواریوں پر بیٹھ کر دنیا کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں، اور کمزور قوموں کو دبوچ لیتے ہیں، اور ان کو دم کے دم میں فنا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

تہذیب جدید کی ناکامی

حضرات! یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے مفکر اب اس کا اعتراف کرنے لگے ہیں کہ تہذیب جدید نے وسائل پیدا کیے مگر مقاصد نہیں دیے، وسائل بغیر مقاصد کے بیکار ہیں، ہم ایشیا کے رہنے والے یورپ سے کہہ سکتے ہیں کہ تمہارے وسائل اور تمہاری ترقیاں

اور تمھارے انکشافات ناقص ہیں، سو ذریعے ایک مقصد کی بھی خانہ پری نہیں کر سکتے، تمھاری تہذیب، تمھارا فلسفۂ زندگی، تمھاری ترقیاں، اچھے مقاصد اور نیک خواہشات پیدا کرنے سے قاصر ہیں، تم یہ تو کر سکتے ہو کہ اچھے سے اچھے کام کے ذرائع پیدا کر دو، مگر اچھے کام کرنے کا رجحان پیدا نہیں کر سکتے، رجحان کا تعلق دل سے ہے، اور تمھارے وسائل اور تمھاری ایجادات کی وہاں تک رسائی نہیں، اور جب تک اچھے کام کا رجحان نہ ہو، ذرائع اور کام کے امکانات کچھ نہیں کر سکتے، اچھے کام کا رجحان اور اس کا شدید تقاضا پیدا کرنا پیغمبروں کا کام تھا، اور ان کی تعلیم اب بھی اس کا واحد ذریعہ ہے، انھوں نے بہت بڑے پیمانہ پر اس کو پیدا کر کے دکھایا، لاکھوں انسانوں کے دل میں نیک کام کی خواہش، خدمت کا جذبہ، ظلم اور بدی کی نفرت پیدا کر دی، اور انھوں نے اپنے محدود ذرائع سے وہ کام کر کے دکھا دیے جو آج وسیع ذرائع سے نہیں ہو رہے ہیں۔

مذہب کے کرنے کا کام

بہت سے بھائی اس زمانہ میں سمجھتے ہیں کہ مذہب کے پاس کوئی پیغام نہیں، اور مذہب اس دور کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا، مگر میں اس کی تردید کرتا ہوں، اور چیلنج کرتا ہوں کہ مذہب آج بھی یورپ کی رہنمائی کر سکتا ہے، صحیح اور طاقتور مذہب ہی ہے جو نیکی کا رجحان اور نیک عمل کی خواہش پیدا کرتا ہے، اور یہی زندگی کی کنجی ہے، آج دنیا سخت انتشار میں مبتلا ہے، یورپ کے پاس وسائل ہیں، لیکن مقاصد نہیں، اگر وسائل اور مقاصد کا جوڑ ہو جائے تو دنیا کا نقشہ بدل جائے۔

ذرائع کی کثرت نے ملکوں کو غلام بنایا

آج اس تہذیب نے اتنے وسائل پیدا کر دیے کہ ان سے کام لینے کا میدان نہیں ملتا، وسائل اپنے لیے منڈیاں تلاش کر رہے ہیں، یہ تلاش و جستجو قوموں کو غلام بنانے اور آزاد ملکوں کو اپنی تجارت کی منڈی بنانے پر آمادہ کرتی ہے، کبھی کبھی اس کو جنگ کی ضرورت

پڑتی ہے، تا کہ یہ نئے نئے اسلحہ ٹھکانے لگیں، جنگ عظیم کی بنیاد ہی ان ہوس پرست اسلحہ سازوں اور کارخانہ داروں نے ڈالی تھی، جن کو اپنے سامان کی کھپت جنگ ہی میں نظر آتی تھی، آج کپڑوں، جوتوں اور طرح طرح کے صنعت کے نمونے نکلتے ہیں، اور ان کی کھپت کے لیے جگہ نہیں، ہماری اس تہذیب کو ذرائع کا تخمہ ہو گیا ہے، اور اخلاقی قوت اور یقین کی روشنی اس کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں۔

ایشیا کا فرض

ایشیائی ممالک کا فرض تھا کہ وہ یورپ کے مال کی منڈی بننے کے بجائے، اور یورپ کے ذرائع و وسائل کی خوشہ چینی کے بجائے اس نازک وقت میں یورپ کی مدد کرتے، اس کو اخلاق کا سبق دیتے، اس میں ایمان ویقین کی روشنی اور اخلاقی رجحان پیدا کرنے کی کوشش کرتے، اس لیے کہ ان کے پاس مذہب کی طاقت ہے، اور یورپ صدیوں پہلے اس دولت سے محروم ہو چکا ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ ملک خود اس اخلاقی رجحان اور انسانی صفات میں دیوالیہ ہوتے جا رہے ہیں، وہ خود یورپ کی بیماریوں کا شکار ہوتے جا رہے ہیں، ان ممالک میں خود فراموشی، خود غرضی کی وبا پھیلی ہوئی ہے، اور دولت پیدا کرنے کا ایک جنون سوار ہے، ان ممالک کی سوسائٹی کو گھن لگ گیا ہے، ان ممالک کے لیے یہ سب سے بڑا خطرہ ہے، اس سے زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ ملک کا کوئی ادارہ اور کوئی جماعت اس خطرہ کو محسوس نہیں کر رہی ہے، اور اخلاق کی اصلاح، ایمان ویقین کی تبلیغ اور سیرت کی تعمیر کا کام انجام نہیں دے رہی ہے، حالانکہ یہ کام ہر کام پر مقدم تھا اور ہر تعمیری کام کی تکمیل اسی پر منحصر ہے۔

وقت کا سب سے اہم کام

بھائیو! یہ بات سارے سال کے لیے کافی ہے، اور میں اس امید پر یہ کہہ رہا ہوں کہ شاید کوئی ایک بیدار مغز، زندہ دل، سلیم الفطرت انسان میری بات کو مان لے، کہنے اور

کرنے کی بات یہی ہے کہ پیغمبروں کا راستہ اختیار کیا جائے، خدا کی ہستی کا یقین اور مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین پیدا کیا جائے، زندگی میں خدا کی فرمانبرداری اختیار کی جائے، جن کو خدا نے علم دیا ہے، دولت دی ہے، وسائل دیے ہیں، وہ دنیا میں نیکی کی زندگی کے لیے کوشش کریں، معلومات اور اخلاق میں مناسبت اور توازن قائم کیجیے، معلومات اور زبان تو رشیوں کی، اور عمل اور اخلاق راکششوں کے؟ یہ کہاں کی انسانیت ہے؟ جب تک وسائل اور مقاصد میں ہم آہنگی، اور علم اور اخلاق میں تناسب نہیں ہوگا، یہ دنیا اسی طرح برباد ہوتی رہے گی، وسائل آپ کو یورپ سے مل سکتے ہیں، میں ان کے اختیار کرنے سے منع نہیں کرتا، لیکن مقاصد اور اچھے رجحانات اور خواہشات آپ کو ایک پیغمبر سے مل سکتی ہیں، اور آپ کے لیے اس سے فائدہ اٹھانے کا ہر وقت موقع ہے، اس سے یقین کی دولت اور نیکی کا رجحان لے کر آپ اپنی زندگی کو بھی بنا سکتے ہیں، اور یورپ کو بھی اس ہلاکت سے بچا سکتے ہیں، جو اس کے سر پر اور اس کے ذریعہ ساری دنیا کے سر پر منڈلا رہی ہے۔(۱)

(۱) ۲۴ رفروری ۱۹۵۵ء ساڑھے سات بجے شب میں بنارس کے وکٹوریہ پارک میں ایک جلسۂ عام میں کی گئی تقریر۔ ماخوذ از "مقام انسانیت" (صفحہ ۳۳ تا ۴۶)۔

انسان کی تلاش

مجھے انسان کی تلاش ہے

عزیزو اور دوستو! آج سے پورے سات سو برس پہلے ترکی کے حدود میں ایک بڑے مشہور شاعر اور حکیم گزرے ہیں، جن کا نام مولانا رومؒ ہے، آپ نے ان کی مثنوی سنی ہوگی، انھوں نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے، وہ میں آپ کو سناتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ ''کل رات کا واقعہ ہے، ایک ضعیف العمر آدمی چراغ لیے شہر کے گرد گھوم رہے تھے اور اندھیری رات میں کچھ تلاش کر رہے تھے، میں نے کہا: حضرت سلامت، آپ کیا تلاش کررہے ہیں؟ فرمانے لگے کہ ''مجھے انسان کی تلاش ہے، میں چوپایوں اور درندوں کے ساتھ رہتے رہتے عاجز آگیا ہوں، میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے، اب مجھے ایک ایسے انسان کی تلاش ہے جو خدا کا شیر اور مرد کامل ہو''۔ میں نے کہا: ''بزرگوار! اب آپ کا آخری وقت ہے، انسان کو آپ کہاں تک ڈھونڈیں گے؟ اس عنقا کا ملنا آسان نہیں، میں نے بھی بہت ڈھونڈا ہے لیکن نہیں پایا''، ان بزرگوار نے جواب دیا کہ ''میری ساری عمر کی عادت ہے کہ جب کسی چیز کو سنتا ہوں کہ وہ نہیں ملتی تو اس کو اور زیادہ تلاش کرتا ہوں، تم نے مجھے اس بات پر آمادہ کردیا کہ میں اس گمشدہ انسان کو اور زیادہ ڈھونڈوں اور اس کی تلاش سے کبھی باز نہ آؤں''۔

حضرات! یہ ایک شاعر کا مکالمہ ہے، آپ کو شاید تعجب ہو کہ کیا کوئی ایسا بھی وقت تھا کہ انسان بالکل نایاب ہو گیا تھا؟ مولانا رومؒ نے ہمارے ذہن میں ایک سوال پیدا کردیا

کہ کیا ہر انسان انسان نہیں ہے؟ اور کیا انسانوں کی بڑی بڑی آبادیوں میں بھی انسان نایاب ہے؟ ہم تو سمجھتے تھے کہ انسان کی ایک ہی قسم ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو دیکھنے میں انسان ہے لیکن حقیقت میں انسان نہیں ہے اور دنیا میں ہمیشہ انہی لوگوں کی کثرت رہی ہے، دوسرے وہ جو حقیقت میں انسان ہیں، اور وہ کبھی ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ ان کو چراغ لے کر ڈھونڈنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

مولانا رومؒ کو سات سو برس ہو چکے، ان کے بعد سے دنیا میں بڑی ترقیاں ہوئیں، ہر شہر میں انسانوں کی تعداد بڑھتی رہی ہے، اور آج کی انسانی آبادی پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی ہے اور اس کی ترقیاں بھی بہت وسیع ہیں، آج انسان نے بجلی، بھاپ، ہوا اور پانی پر قبضہ جمالیا ہے، ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹی وی اور ایٹم بم سے انسانوں کی ترقی اور فتوحات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، لیکن دوستو! انسانوں کی ترقی کا اندازہ مردم شماری کے نقشوں، اور بڑے بڑے متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں کی تصویروں سے کرنا صحیح نہیں ہے، انسانیت کی ترقی ان مادی ترقیات کا نام نہیں ہے، اور محض نسل انسانی کی ترقی کو انسانیت کی ترقی نہیں کہا جا سکتا، انسانیت کی ترقی کا اندازہ انسانوں کے اخلاق و کردار سے ہوتا ہے، اور اخلاق و کردار کا اندازہ آپس میں ملنے جلنے، ریل کے ڈبوں، پارکوں، ہوٹلوں، دفتروں اور بازاروں میں ہو سکتا ہے، اردو کے مشہور شاعر اکبر الہ آبادی نے بالکل صحیح کہا ہے ؎

نقشوں کو تم نہ جانچو، لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے

انسانیت سے بغاوت

انسانیت کا صحیح اندازہ امتحان پڑنے پر اور ایسے مواقع پر ہوتا ہے جب ہر قسم کے ذرائع اور مواقع حاصل ہوں کہ چوری، گناہ، حق تلفی کی جا سکے، مگر انسان کے اندر کی کیفیات اس کا ہاتھ پکڑ لیں، جہاں انسانیت کا گلا گھونٹا جا رہا ہو، وہاں انسانیت اپنا جوہر

دکھائے، انسانیت کا اندازہ ہماری موجودہ زندگی کے سانچوں اور مادی ترقی کے پیمانوں سے نہیں ہوسکتا۔

انسانیت درحقیقت ایک بڑا مرتبہ ہے، لیکن انسانیت کے خلاف انسان ہمیشہ خود بغاوت کرتا رہا ہے، اس کو انسانیت کی سطح پر قائم رہنا ہمیشہ دوبھر اور مشکل معلوم ہوا ہے، وہ کبھی پیچھے سے کترا کر نکل گیا، اور اس نے کبھی اپنے آپ کو انسانیت سے برتر سمجھا، یعنی اس نے کبھی انسانیت سے بالاتر کہلوانے اور خدا اور دیوتا بننے کی کوشش کی، اور سچی بات یہ ہے کہ لوگوں نے خدا اور دیوتا بننے کی کوشش کم کی، لوگوں نے انہیں خدا اور دیوتا بنانے کی کوشش زیادہ کی، ہم اگر فلسفہ اور روحانیت کی تاریخ پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ لوگ انسانیت سے بلند تر کسی مرتبہ کی تلاش میں رہے، اور انسانوں کو انسانوں کا صحیح مقام سمجھانے کے بجائے اس سے اونچا ہونے کی فکر کرتے رہے، اس کے بالمقابل دوسری کوشش یہ رہی کہ انسان کو انسانیت سے گرادیا جائے، وہ حیوانی اور نفسانی زندگی کا عادی بنے اور دنیا میں من مانی زندگی کا رواج ہو۔

ان دونوں کوششوں کے نتائج دنیا میں ہمیشہ خراب ہوئے ہیں، جب انسان کو انسانیت سے اٹھا کر خدا یا دیوتا بنایا گیا تو دنیا میں بدنظمی پھیلی اور بڑا فساد برپا ہوا، دنیا میں لوگوں نے جب خدائی کا دعویٰ کیا، یا لوگوں نے ان کو یہ درجہ دیا تو دنیا میں بگاڑ بڑھتا گیا اور انسانی زندگی میں نئی نئی گرہیں پڑیں، جب ایک معمولی سی گھڑی کسی اناڑی کے ہاتھ پڑ جاتی ہے اور وہ اس کی مشین میں دخل دیتا ہے تو وہ بگڑ جاتی ہے، تو یہ نظام عالم ان مصنوعی خداؤں سے کیسے چل سکتا ہے؟ اس دنیا کے اتنے مسائل، اتنے مراحل اور اس میں اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ اگر ایک انسان اس دنیا کو چلانا چاہے تو یقیناً اس کا انجام بگاڑ ہوگا، میرا منشا یہ نہیں کہ انسان انسانیت کے دائرہ میں ترقی نہ کرے، بلکہ یہ کہ انسان خدائی کی کوشش نہ کرے، اس نے انسانیت ہی میں کونسی کامیابی حاصل کرلی ہے کہ اب وہ خدائی کی ہوس کرے۔

تو کار زمیں رانکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

مذاہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب اس قسم کی کوشش کی گئی تو ایسی پیچیدگیاں رونما ہوئیں جن کا کوئی علاج نہ تھا، یہ کوشش دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہمیشہ تھوڑے وقفہ سے ہوتی رہی ہے، ایسے لوگوں نے فطرت سے زور آزمائی کی ہے اور فطرت سے لڑ کر انسان نے ہمیشہ شکست ہی کھائی ہے۔

دوسری طرف اکثر ایسے انسان گزرے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو چوپایہ جانا، ان کو بحیثیت انسان کے اپنی ترقی کا کوئی احساس نہیں ہوا، اپنی انسانیت، اپنی روحانیت اور خداشناسی کو ترقی دینے کا ان کو کبھی خیال تک نہیں ہوا، دنیا میں زیادہ تعداد انہی انسانوں کی رہی ہے۔ اس زمانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یہ دونوں بغاوتیں، یہ دونوں عیب اور یہ دونوں فساد جمع ہو گئے ہیں، اس وقت تقریباً ساری دنیا انہی دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، چند آدمی ہیں جو خدائی کے دعویدار ہیں، اور جن کو دیوتا بننے کا شوق ہے، باقی اکثر وہ انسان ہیں جو چوپایوں اور درندوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں، اس لیے اس زمانہ کا بگاڑ ہر زمانے کے بگاڑ سے بڑھ گیا ہے اور زندگی عذاب جان بن گئی ہے۔

اس وقت مردم شماری کے خانوں میں کوئی ایسا خانہ نہیں کہ جو لوگ اپنی انسانیت کی قدر کرتے اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرتے ہیں، اس میں ان کا اندراج کیا جائے گا، مگر آپ خود ہی انصاف کیجیے کہ آپ کے چاروں طرف زندگی کا جو طوفان اٹھا ہوا ہے، اس میں کتنے انسان ہیں جن کو انسانیت کا احساس ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں صرف ایک معدہ اور پیٹ ہی نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اللہ نے انسان کو روح بھی دی ہے، دل بھی دیا ہے اور دماغ بھی عطا کیا ہے، جن کو ہم ہمیشہ نظر انداز کرتے اور ان کے صحیح استعمال سے بچتے ہیں، ہم جنسی خواہشات اور مادی ضروریات کے ریلے میں ایسے بہے چلے جا رہے ہیں، جیسے ایک گاڑی اپنے اختیار سے باہر لڑھک رہی ہو، جس پر کسی کا کوئی قابو نہ ہو۔ میں اور سمجھا کر

کہوں یوں سمجھئے کہ انسانیت ایک سائیکل ہے اور وہ سائیکل ایک ڈھلوان پل پر سے پھسل رہی ہے، اس میں نہ کوئی گھنٹی ہے، نہ بریک، اور نہ اس کے ہینڈل پر کسی کا ہاتھ ہے۔

جغرافیہ کی پرانی تعلیم یہ بتلاتی تھی کہ زمین چپٹی ہے، جغرافیہ کی نئی تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمین گول ہے، لیکن مجھے جغرافیہ کے استاد اور طالب علم معاف کریں، میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ زمین ڈھلوان ہے، اس لیے کہ ساری قومیں اور ان کے تمام افراد اخلاقی بلندی سے حیوانی پستی کی طرف لڑھکتے چلے آرہے ہیں، اور روز بروز ان کی رفتار تیز ہوتی جارہی ہے۔ ہماری زمین کا یہ کرہ ضرور آفتاب کے گرد گردش کررہا ہے، مگر اس کرۂ ارض پر بسنے والا انسان مادیت اور معدہ کے گرد چکر لگا رہا ہے، زمین کی گردش کا انسانوں کے اخلاق اور معاملات پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن انسانوں کی اس گردش کا تمام دنیا کے اخلاق اور حالات پر اثر پڑ رہا ہے، نظام شمسی میں حقیقی مرکز آفتاب ہو یا زمین، لیکن عملی زندگی میں انسانوں کا حقیقی مرکز معدہ یا پیٹ اور حیوانی عنصر بنا ہوا ہے، اور ساری انسانیت اس کے گرد چکر لگا رہی ہے، آج دنیا میں سب سے وسیع رقبہ معدہ کا ہے، یوں کہنے کو تو وہ انسان کے جسم کا بہت مختصر حصہ ہے، لیکن اس کا طول وعرض اور عمق اتنا بڑھ گیا ہے کہ ساری دنیا اس میں سماتی چلی جارہی ہے، یہ معدہ اتنی بڑی خندق ہے کہ پہاڑوں سے بھی نہیں بھرتا، آج سب سے بڑا مذہب، سب سے بڑا فلسفہ معدہ کی عبادت ہے، تعلیم گاہوں میں اسی کا غلام بنانا سکھایا جارہا ہے، آج کامیاب انسان بننے کا فن سکھایا جاتا ہے، دوسرے الفاظ میں دولت مند بننے کا، آج دولت مند بننے کی ریس ہے، دولت مند بننے کی حرص اتنی بڑھ گئی ہے کہ انسان کو خود اپنے تن من کا ہوش نہیں رہا، مطالعہ، علم اور فنون لطیفہ کا مقصد بھی یہی ہوگیا ہے کہ انسان کہاں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ حاصل کرسکتا ہے؟ سب سے بڑا علم اور ہنر یہ ہے کہ لوگوں کی جیبوں سے کس طرح روپیہ نکال کر اپنی جیب بھری جائے؟ اتنا ہی نہیں بلکہ تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت مند بننے کی کوشش کی جاتی ہے، دولت

مند بننے کی کوشش تمدن اور سوسائٹی کے لیے اتنی مضر نہیں جتنی جلد دولت مند بننے کی ہوس ہے، یہی ہوس رشوت، خیانت، غبن، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی اور حصول دولت کے دوسرے مجرمانہ ذرائع پر آمادہ کرتی ہے، اس لیے کہ ان مجرمانہ طریقوں کے بغیر جلد دولت مند بننا ممکن نہیں، اس ذہنیت کی وجہ سے ساری دنیا میں ایک مصیبت برپا ہے، دفتروں میں طوفان ہے، منڈیوں میں قیامت کا منظر ہے، آج انسان جونک بن گئے ہیں، اور انسان کا خون چوسنا چاہتے ہیں، آج کوئی کام بے غرض و بے مطلب نہیں رہا، آج کوئی شخص بغیر اپنے فائدہ اور مطلب کے کسی کے کام نہیں آتا، آج ہر چیز اپنی مزدوری اور فیس مانگتی ہے، کبھی کبھی تو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ اگر درخت کے سایہ میں دم لیں گے تو شاید درخت بھی اپنی فیس اور مزدوری مانگنے لگیں گے، اقبال نے کہا ہے ۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

لیکن ان تین طبقوں کی یہ خصوصیت نہیں، سب کا حال یہی ہو رہا ہے کہ دولت اور خواہشات نفس کا نشہ سوار ہے، آج دولت کمانا ہی زندگی کا مقصد بن گیا ہے، اور ساری دنیا اس کے پیچھے دیوانی ہے، آج جس انسان کو طالب خدا ہونا چاہیے تھا، اس کی معرفت اور محبت سے اپنا ویران دل آباد، اپنا اندھیرا دماغ روشن، اپنی بے مقصد و بے کیف زندگی بامقصد اور پرکیف بنانی چاہیے تھی، سارے دل اور دماغ کے ساتھ اس سے محبت کرنی چاہیے تھی، اور اس کے راستہ میں سب کچھ مٹا کر حقیقی زندگی حاصل کرنی چاہیے تھی، صد حیف کہ وہ انسان حقیقی محبت، اور صحیح معرفت سے محروم ہے، اس لیے زندگی کی اصل لذت سے محروم ہے، حقیقی انسانیت سے محروم ہے، اور افسوس ہے کہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کو اس محرومی کا احساس بھی نہیں، آج جس انسان کو خدا کا پرستار ہونا چاہیے تھا، وہ دولت کا پرستار اور نفس کا غلام بنا ہوا ہے، اور اس کو اس خلاف فطرت غلامی کا احساس بھی نہیں۔

ہر جگہ نفس کا قبضہ ہے

سیاسی اختلافات اور نظام سلطنت تو فرصت کی باتیں ہیں، ہم تو یہ جانتے ہیں کہ حکومت، اندرون حکومت خواہشات کی ہے، حکومت پر قبضہ خواہ کسی قوم یا پارٹی کا ہو، اور خواہ کوئی صدر یا وزیر ہو، مگر دراصل ہر جگہ نفس کا قبضہ اور خواہشات کا تسلط ہے، پہلے برطانیہ کے متعلق کہتے تھے کہ اس کی سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا، لیکن آج جس حکومت اور سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا، وہ نفس کی خواہش اور من کی چاہت ہے۔

وقت کا فرمان یہ ہے کہ نفس کی خواہش پوری کی جائے، دل کی آگ بجھائی جائے، چاہے انسانوں کے خون کی نہریں بہتی ہوں، خواہ انسانوں کے اوپر ان کی لاشوں کو روندتے ہوئے گزرنا پڑے، خواہ قومیں اس راستہ پر پامال ہو جائیں، خواہ ملک کے ملک ویران اور تباہ ہو جائیں۔

لیکن اس میں ذرا تعجب کی بات نہیں، سینکڑوں برس سے جو تعلیم انسانوں کو دی جارہی ہے، خواہ وہ تعلیم گاہوں کے ذریعہ ہو یا سینماؤں کے ذریعہ، یا ادب و شاعری کے ذریعہ، جو ہر ملک اور ہر قوم میں رائج ہے، اس کا ماحصل یہی ہے کہ تم من کے راجہ اور نفس کے غلام ہو۔

دوستو! اس زمانے کے سارے انسانوں کی آبادیاں اس لحاظ سے ایک سطح پر ہیں، اور اس کے خلاف کوئی آواز سنائی نہیں دیتی، ملکوں کے خلاف بغاوت کرنے والے بہت ہیں، چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے لیے بھوک ہڑتال کرنے والے بہت ہیں، مقامی مسائل کے لیے جان کی بازی لگا دینے والے بہت ہیں، لیکن انسانیت کے لیے مرنے والے کتنے ہیں؟ کتنے ایسے ہیں جن کو حقیقی انسانیت کی فکر ہے؟ آج دنیا میں اگر کسی کو انسانیت کے انحطاط کا احساس بھی ہے تو اس میں یہ جرأت نہیں ہے کہ انسانیت کے لیے آواز اٹھائے، سارے کرۂ ارض میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو انسانیت کے لیے اپنی قربانی دے۔

پیغمبروں کی بے غرضی و بے نیازی

دراصل پیغمبروں ہی کی جرأت تھی، خواہ وہ ابراہیمؑ ہوں یا موسیٰؑ، یا عیسیٰؑ ہوں یا محمدؐ (اللہ کا درود و سلام ہو ان پر) کہ انھوں نے ساری دنیا کو چیلنج کر کے، انسانیت کے خلاف جو بغاوت جاری تھی، اس سے روکا، ان کے سامنے دنیا کی لذتیں اور دولتیں لائی گئیں مگر انھوں نے سب کو ٹھکرا دیا، اور انسانیت کے درد میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا، اللہ کے برگزیدہ اور منتخب بندوں کی یہ جماعت، جس کو پیغمبروں کی جماعت کہا جاتا ہے، دنیا کو کچھ دینے کے لیے آئی تھی، دنیا سے کچھ لینے کے لیے نہیں آئی تھی، ان کی کوئی ذاتی غرض نہ تھی، انھوں نے دوسروں کے پنپنے کی خاطر اپنے کو مٹایا، انھوں نے دوسروں کی آبادی کی خاطر اپنے گھروں کو اجاڑا، انھوں نے دوسروں کی خوشحالی کے لیے اپنے متعلقین کو فقر و فاقہ میں مبتلا کیا، انھوں نے غیروں کو نفع پہنچایا اور اپنوں کو منافع سے محروم کیا، کیا دنیا کے رہنماؤں میں ایسی بے غرضی اور خلوص کی مثالیں مل سکتی ہیں؟ پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانے میں اپنی اپنی قوموں میں خلش پیدا کی اور ان کو محسوس کرایا کہ موجودہ زندگی خطرہ کی ہے، جو لوگ اطمینان کے عادی تھے اور میٹھی نیند سو رہے تھے اور میٹھی نیند ہی سونا چاہتے تھے، انھوں نے پیغمبروں کی اس دعوت اور تنبیہ کے خلاف سخت احتجاج کیا اور بڑی شکایت کی کہ انھوں نے ہمارا عیش مکدر کر دیا اور ہماری نیند خراب کی، لیکن جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھتا ہے، وہ سونے والوں کی پرواہ نہیں کرتا اور اس کو کسی کی نیند پر ترس نہیں آتا، پیغمبر انسان کے حقیقی ہمدرد تھے، وہ دنیا کو خواب خرگوش سے بیدار کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے، دنیا کے گمراہ رہنماؤں اور نفس کے بندوں نے دنیا کو مارفیا (Morphia) کے انجکشن دیے، اور اس کو تھپک تھپک کر سلا دیا، مگر پیغمبروں نے انسانوں کو جھنجھوڑا اور غفلت سے بیدار کیا، یہ چھوٹی چھوٹی جنگیں اور لڑائیاں دراصل اسی لیے ہوئیں کہ دنیا سے غفلت دور ہو، اور دنیا پر جو تاریکی مسلط ہے وہ ختم ہو، انسان حقیقی انسانیت کو سمجھے۔

پیغمبر اسلام (ﷺ) کی شخصیت

ہمارے سامنے سب سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ واضح اور روشن، سب سے زیادہ بلند مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کا اظہار نہ کریں تو یہ ایک خیانت ہوگی، ہمارا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ان کے اس احسان کو نہ بتلائیں، جو انھوں نے انسانیت پر کیا۔

جب دنیا میں ایک انسان یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اللہ ہی اس دنیا کو اکیلا چلا رہا ہے اور وہی بندگی اور اطاعت کا مستحق ہے، آپ نے اس حق کا اعلان کیا اور اس آواز کو بلند کیا کہ آج دنیا کے ہر حصے سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے، اور جب کوئی آواز سننے میں نہیں آتی تو یہی آواز کانوں میں آتی ہے، آج یہ آواز تمام دنیا میں پھیل گئی ہے۔

آپ کی تعلیم اور آپ نے جو کچھ دنیا کو عطا کیا، وہ انسانیت کا مشترک سرمایہ ہے، جس پر کسی قوم کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی، جس طرح ہوا، پانی اور روشنی پر کسی کو اجارہ داری کا حق نہیں اور کوئی اس پر اپنی مہر اور اپنی چھاپ نہیں لگا سکتا، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ساری دنیا کا حق ہیں، اور ہر شخص کا اس میں حصہ ہے، جو ان سے فائدہ اٹھانا چاہے، یہ دنیا کی تنگ نظری ہے کہ وہ ان حقوق کو کسی قوم یا ملک کی جاگیر سمجھے۔

دوستو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم محسن انسانیت تھے اور ساری انسانیت آپ کی ممنون ہے، دنیا میں جو کچھ عدل وانصاف اس وقت موجود ہے اور جن حقیقتوں کو اس وقت تسلیم کیا جا رہا ہے، وہ سب آپ کا فیض ہے۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

دوستو! ہم اس موجودہ نظام زندگی کو چیلنج کرتے ہیں، ہم لوگوں سے ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ تم دنیا کو آج جتنا بلند سمجھتے ہو، وہ اتنی ہی پست ہے، ہم صاف کہتے ہیں کہ دنیا

تدریجی خودکشی کی طرف جارہی ہے، یہ راستہ انسانیت کی تباہی کا راستہ ہے، میں مسجد سے سیدھا اسٹیج پر نہیں آیا بلکہ کتب خانوں کے راستہ سے، مطالعہ کے راستہ سے، اور معلومات کے راستہ سے آپ کے سامنے آیا ہوں، آپ میں سے کچھ لوگ یورپ کی دو ایک زبانیں جانتے ہوں گے، میں خود یورپ کو جانتا ہوں ؏

تم انگریزی داں ہو، میں انگریز داں ہوں

میں سارے یورپ سے خم ٹھونک کر کہتا ہوں کہ تمہارا پورا نظام زندگی غلط ہے، اور وہ انسانیت کو ہلاکت کی طرف لے جارہا ہے، یہ میرا دعویٰ ہے اور پورے استدلال اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ دنیا کی نجات پیغمبروں ہی کے راستہ میں ہے، اور دنیا کے لیے اس وقت خدا کے یقین، اس کے خوف، دوسری زندگی پر ایمان اور پیغمبروں کی رسالت کے اقرار کے سوا کوئی چارہ نہیں، یہی ہماری دعوت ہے اور یہی ہماری جدوجہد کا مقصد ہے

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے(۱)

---

(۱) لکھنؤ کے ایک مخلوط اجتماع میں کی گئی تقریر۔ ماخوذ از ''اصلاحیات''، (ص: ۱۴۱-۱۵۲)۔

انسانیت کی سب سے اہم ضرورت

دوستو اور بزرگو! اللہ تعالی نے انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے پیدا کیا، اور اس کی ضروریات کو اس دنیا میں بڑی فیاضی اور فراوانی اور افراط کے ساتھ پیدا فرمایا، انسان کی ضروریات کیا ہیں اور ان کا سامان کس طرح کیا گیا ہے، یہ ہم اور آپ سب جانتے ہیں، جن لوگوں نے ذرا بھی اس دنیا پر غور کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ جن چیزوں کی انسان کو سیکڑوں اور ہزاروں برس کے بعد ضرورت پیش آئی ان کا اہتمام دنیا کی ابتدا کے ساتھ کر دیا گیا تھا، انسانی ضروریات کے ہر شعبہ کو چلانے اور ترقی دینے کی صلاحیت اور محبت بھی انسان کی فطرت میں ودیعت کی، اور اس کے لیے ایسے گروہ اور افراد پیدا کیے جو اپنے اُن شعبوں اور پیشوں کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں، حالانکہ ان میں سے بعض ایسے کام ہیں جن سے ہمیں وحشت ہوتی ہے، لیکن ان کے کرنے والے ان پیشوں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں، اور اسی میں دنیا کے نظام کو چلانے اور ترقی دینے کا راز ہے، اسی لیے دنیا میں ہزاروں انقلابات کے باوجود ہر پیشہ اور ہر شعبہ موجود اور ترقی یافتہ ہے۔

سوچنے کی بات

انسان کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس زندگی کو اپنے پیدا کرنے والے کے منشا کے مطابق گزارنے، انسان کے مقصد کو پہچاننے اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی انتظام فرمایا یا نہیں؟ زندگی کے اس سب سے اہم شعبہ اور سب سے زیادہ

ضروری کام کے لیے بھی کوئی سلسلہ یا گروہ دنیا میں جاری رہا یا نہیں، جو اپنے اس مقدس کام کو اپنے زندگی کا مقصد سمجھے اور اس اہم خدمت کے لیے اپنی جان کی بازی لگائے؟

دوستو! انسان کی جو اصل ضرورت ہے، اس کے لیے کوئی انتظام نہ کرنا اللہ کی رحمت سے بعید ہے، اس دنیا میں حکمت، صلاحیت اور ہر شعبۂ زندگی سے مناسبت، سب کچھ موجود ہے، جس کی بڑی دھوم دھام ہے، انسانوں کے معمولی ذہن بھی اسے ماننے کے لیے تیار نہیں کہ انسانوں کی اصل ضرورت اور حقیقی مقصد (کہ کس طرح زندگی گزارنا چاہیے، کس طرح وہ اپنے پالنے والے کو راضی کرسکتا ہے) کا کوئی انتظام نہ کیا گیا ہو، خدا نے انسانوں کی اس اہم ضرورت اور خدمت کے لیے دنیا میں ایک ایسی بے غرض جماعت بھی پیدا کی جو انسانوں کی بتلاتی رہے کہ یہ زندگی تمہاری تابعدار ہے، لیکن تم کسی اور کے تابعدار ہو، اور انسانی زندگی حیوانیت سے بہت ممتاز اور ایک بڑے منصب کی مالک ہے۔

زندگی کا سفر

دنیا میں گاڑیاں چلانے اور معمولی معمولی سفروں کے لیے طرح طرح کے انتظامات موجود ہیں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ زندگی کا سفر بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں؟ میں اس کے ماننے کے لیے تیار نہیں کہ زندگی کا اتنا بڑا سفر بغیر کسی ادارے اور جماعت کے طے ہوسکتا ہے، جس میں طرح طرح کے خطرات، تضاد، رقابتیں اور کشمکش موجود، ہوس کو پورا کرنے کی ایسی حالت ہے کہ نہ ہم رہیں نہ ہماری خواہشات، آپ سانپوں اور بچھوؤں کو جانتے ہیں لیکن انسانی زندگی میں جو سانپ اور بچھو، جو شعلے اور کانٹے اور جراثیم ہیں، وہ زندگی کے سفر کے لیے بڑے خطرناک ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنی خاص رحمت اور فضل سے ان خطرات سے بچانے کا انتظام فرمایا، ہر زمانے میں وہ اپنے برگزیدہ بندے بھیجے جو انسانوں کو ان کے مالک سے متعارف کرائیں اور ان کی اصل فلاح اور حقیقی بہبود کا راستہ دکھائیں، اگر یہ انتظام نہ ہوتا تو انسانیت اور حیوانیت میں کوئی فرق نہ ہوتا، مگر اللہ کو یہ

دنیا چلانی اور انسانی زندگی کو اپنے معیار پر لانا تھا، جس کے لیے اس نے ایسے انسان پیدا کیے جو اس خدمت کو انجام دیں، اور ان کو ایسا خلوص اور ایسی لگن عطا کی کہ وہ انسانوں کی ہدایت اور فلاح کے لیے اپنی ہر عزیز چیز قربان کرتے رہے اور لوگوں کو ان پر شبہ ہوتا تھا کہ نہ معلوم دنیا سے یہ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

آخری پیغمبر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور سیرت و کردار سازی

اللہ تعالیٰ نے ان برگزیدہ بندوں میں سے سب سے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا اور آپ نے ایک جماعت تیار کی جس کی بنیاد معاشرت، تمدن اور کلچر پر نہیں تھی، اور جس کا دائرہ کسی قوم، گروہ یا ملک تک محدود نہ تھا، بلکہ اس نے انسانیت کے سارے عالم کو اپنا پیغام دیا، اور فرمایا کہ میرے پاس وہ لوگ آئیں جو زندگی میں ہوس کے مقابلے میں قناعت، اور خودغرضی کے بجائے بے نفسی، اور نفس پرستی کے بجائے خداپرستی کو ترجیح دیں، جن کا مقصد حیات دنیا میں حشرات الارض کی طرح جینا، شکاری عقابوں اور درندوں کی طرح دوسروں کو پھاڑ کھانا نہ ہو، بلکہ وہ اپنی زندگی سے انسانوں کو انسانیت کا مقام اور اصل مقصد حیات یاد دلائیں، اور ان کی حقیقت بتلائیں کہ وہ دنیا میں خدا کے نائب اور اس دنیا کے امین و متولی ہیں، اور تمھارے لیے اللہ نے جو مقدر کیا ہے، اس کی وسعتیں اس محدود دنیا سے بالاتر ہیں۔

سرگروہِ انبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں مبعوث ہوئے، اس وقت دنیا میں سب کچھ تھا، ملک تھے، قومیں تھیں، حکومتیں تھیں، لیکن کوئی ایک جماعت ایسی نہ تھی کہ اپنی ذات اور اولاد کے علاوہ انسانیت کی فکرمند ہو، انسان بھیڑیوں کی خصلت اختیار کر چکا تھا، جس کا کام اپنے بچوں کو پالنا اور دوسروں کو پھاڑنا تھا، کروڑوں انسانوں میں کوئی ایک آدمی ایسا نہ تھا جو دنیا کی اس نازک گھڑی کو محسوس کرتا، اسی لیے لوگوں کو آپ کے مقصد کو سمجھنے میں بڑی دقت اور کشمکش ہوئی، کیوں کہ اس وقت انسانیت دنیا کی ایک منڈی

بنی ہوئی تھی، ایک دوسرے کو اپنا گاہک سمجھتا تھا، انسانیت کی روح لرز رہی تھی، بڑے بڑے فلسفی شاعر اور حکماء اس اضطراب سے ناآشنا اور خطرے سے ناواقف تھے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی اس ذہنیت کے بدلنے کے لیے ایک ایسی جماعت بنائی جس نے ایمان، یقین، عمل اور دعوت کے مجموعہ کی قوت سے اس بات کا فیصلہ کیا کہ انسانیت کو ہلاکت اور تباہی کے سمندر میں ڈوبنے سے بچائیں گے، آپ نے ایسے بے لوث اور جاں باز گروہ کی تشکیل کی جو اس خطرے میں انسانیت کی کمر پکڑ لیں، اور زندگی کے دھارے کا رخ موڑ دیں، اور دنیا کو چیلنج کریں، اور زندگی کی پٹری پر اپنے آپ کو ڈال دیں کہ اب اس لائن پہ نہیں چلنے دیں گے، یہ وہ امت ہے جس نے اللہ کی طرف بلانے اور ہدایت کا راستہ دکھلانے کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک وقت میں دنیا کی بڑی سے بڑی عزت، لذت اور بالاتری کی پیش کشوں کو ٹھکرا کر اپنے فیصلے سے انسانیت کے مستقبل کو روشن اور دنیا کی زندگی کو با مقصد بنایا، اور دنیا کے سامنے ایک نیا نقشہ یا نظام حیات پیش کیا جس کی بنیاد چند خاص اصولوں پر رکھی، جن لوگوں نے ان کو اختیار کیا ان کا امتیاز محض چند حقیقتوں کو تسلیم کر لینا یا محض ایک دھرم اور خاص طرز زندگی نہ تھا، حضور کی نبوت اس پر قناعت نہیں کر سکتی تھی، قرآن گواہ ہے اور بڑی ناانصافی ہوگی جو یہ سمجھا جائے کہ آپ کا پیغام یا مشن محض ذاتی عقیدے اور عمل تک محدود تھا، بلکہ آپ نے جو جماعت قائم کی وہ اپنے عقیدے اور عمل کے ساتھ اس بات کا فیصلہ کر چکی تھی کہ اپنی تمام قوت اور صلاحیت اور ہر عزیز شئے کو دنیا سے برائی کو روکنے، اور نیکی کو پھیلانے کے لیے قربان کرے گی، اور مستقبل کے لیے انسانی ہدایت کا راستہ کھولے گی، اس کا مقصد نیکی اور برائی میں محض امتیاز نہ تھا، بلکہ نیکی کو بدی پر غالب کرنے کا فیصلہ اور عزم بھی تھا، دنیا سے خدا فراموشی اور خواہش پرستی کو ختم کرنا تھا، انھوں نے بدی، ظلم، نفس پرستی، خدا فراموشی کے خلاف ایک مورچہ قائم کیا اور اس کا فیصلہ کیا کہ ان کو آخر وقت تک

اس مورچہ پر جنگ کرنی ہے، اور بدی کی طاقت کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگا دینا ہے، اور حق کو دنیا میں غالب کرنا ہے، انھوں نے اس کا بھی فیصلہ کیا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے اگر ان کو اپنی تمام لذتوں، راحتوں، عزتوں کو قربان کرنا پڑے، تو وہ تیار ہیں۔

عقیدہ، عمل اور دعوت

دوستو! صرف دھرم اور عقیدہ دنیا کے حالات میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا، اس کے ساتھ اگر عمل بھی ہو تب بھی دنیا سے برائی کو نہیں روک سکتا، عقیدے اور عمل کے ساتھ دعوت، اسلام کا یہ اصل مشن ہے، یہی وہ مجموعہ ہے جو پیغمبر اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا، اور یہی وہ مجموعہ ہے جو ڈوبی ہوئی ناؤ کو تیرا سکتا ہے، لیکن آج دنیا میں اس مجموعہ کی مثال مشکل سے ملتی ہے، وہ یقین جو زندگی پر اثر انداز اور اپنے خلاف چلنے میں مانع ہو، وہ عمل جس سے دنیا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور وہ دعوت جو مشرق میں خدا فراموشی کی آواز سن کر مغرب سے لڑ جانے کے لیے بے چین ہو، نظر نہیں آتی، آج دنیا کو پھر اس کی ضرورت ہے کہ عقیدے اور عمل کے ساتھ دعوت کو اختیار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل مقصد کو اپنایا جائے جو اس دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے، اللہ کے پیغمبر صحیح عقیدہ، صحیح عمل اور بے غرض دعوت لے کر آئے، اور اسی بنیاد پر ایک جماعت قائم کی جو مسلمان کہلائی۔

آج اگر عقیدہ ہے تو عمل نہیں، اور عمل ہے تو دعوت نہیں، اور اگر دعوت ہے تو عقیدہ اور عمل نہیں، صرف تحریکیں، تحریریں اور تقریریں ہیں، خدا کی ہستی پر یقین مفلوج ہو کر رہ گیا ہے، آج دنیا میں دعوتیں ہیں تو سب کی تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ ہماری ذات، ہماری اولاد، اور اگر بہت ترقی کی تو ہماری قوم اور ہمارا ملک، ان کی دعوت کی غرض ساری انسانیت، اور اصل مسئلہ انسانی مسئلہ نہیں ہوتا، آج ایمانی اور پاکیزہ اور خدا ترس زندگی کی دعوت کون دے رہا ہے؟ کون انسانیت کی تباہی کے درد سے بے چین ہے؟

زیادہ سے زیادہ صحت کی بربادی یا سیاسی زوال یا ملکی مشکلات ومسائل پیش نظر ہیں، ہمارے کان لگے رہتے ہیں کہ کسی گوشے سے ہم صحیح اور ٹھوس بات سنیں، ہم نے بارہا بڑے اشتیاق اور توقعات کے ساتھ تقسیم اسناد کے خطبے اور بڑے مفکرین کی تقاریر اور مضامین پڑھے، لیکن ہم بڑے مایوس ہوئے کہ کہیں انسانیت کے مقام، خدا کے یقین، اور مرنے کے بعد کا ذکر تک نہیں ملتا، اور اخلاق اور سچی خداترسی کا یقین اور زندگی کے اس بگڑے ہوئے سانچے پر گہری تنقید نہیں ملتی۔

ہم مسلمانوں سے خاص طور سے کہتے ہیں کہ جو زندگی وہ گزار رہے ہیں، وہ ان کی تاریخ اور ان کے دعوے اور عقیدے سے مطابقت نہیں رکھتی، آج وقت کی پکار یہ ہے کہ تم اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھو، دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہر اور کارخانے اور مادی ترقی کا عروج دنیا کو تباہی سے بچانے سے قاصر ہیں، تم نے اپنی ذمہ داری کو بھلا دیا اور وہی طرز زندگی اختیار کیا جو دنیا کی خدا فراموش قوموں نے اختیار کر رکھا ہے، آج دنیا میں اس کی ضرورت ہے کہ تم اپنے عقیدے، عمل اور بے غرض دعوت کی زندگی پیش کرو، دنیا تمہاری طرف دوڑے گی اور اسی نظام حیات سے زندگی کی گاڑی دلدل سے نکل سکتی ہے، آپ اپنے اس منصب کو پہچانیے، اور انسانوں کو بتلایئے کہ اے دنیا کے مقصود! اے دنیا کے سردار! تو کہاں بھٹک رہا ہے؟ تو کس پست ہمتی اور کس خودکشی میں مبتلا ہے؟ میں اپنے دوستوں اور وطنی بھائیوں سے کہتا ہوں کہ آج ہر شعبے کے لیے پلان اور ہر مقصد کے لیے منصوبہ بنایا جارہا ہے، لیکن کیا زندگی کا اصل کام اور حقیقی مقصد اس قابل نہیں کہ اس کے لیے بھی جدوجہد کی جائے؟ آج ملک میں اس مقصد کے لیے کوئی سرگرم منظّم جدوجہد و تحریک نہیں پائی جاتی، زندگی کو تباہی کی دعوت دینے، اور اخلاق کو بگڑنے اور انسانیت کو کچلنے اور نفس کی خواہشات کو پورا کرنے کا سامان قدم قدم پر موجود ہے اور اس کی ترغیبات کا جال بچھا ہوا ہے، لیکن انسانی خوبیوں کو ابھارنے اور باخبر زندگی گزارنے، ایمان و یقین

اور نیک کردار پیدا کرنے کی کہیں دعوت موجود نہیں۔

سب سے بڑی خدمت

میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ اگر تم خلوص، ہمدردی اور بے غرضی کے ساتھ دعوت دو، تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان اس کی قدر نہ کریں، محبت کو کسی سفارش کی ضرورت نہیں، سچائی خود اپنا راستہ اور مقام پیدا کر لیتی ہے، مسلمانو! تمہاری زندگی کا راز اسی تجارت میں ہے کہ تم وہ سودا بازار میں لاؤ جو دنیا میں نایاب اور انسانیت کے لیے آب حیات ہو، تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مقصد کے لیے مقرر کیا تھا، اور جو بھی یہ زندگی لے کر اٹھے گا وہ آنکھوں کا تارا اور سب کا دولارا ہوگا، مسلمانو! حضورؐ کی لائی ہوئی پاکیزہ زندگی کو اپنا نمونہ اور آپ کی دعوت کو اپنا مقصد حیات بنانا اس وقت کی سب سے بڑی خدمت اور ہمارا اصلی پیغام ہے۔(۱)

---

(۱) ۱۱ر فروری ۱۹۵۶ء کو میونسپل پارک، لال باغ، لکھنؤ میں ایک مخلوط اجتماع میں کی گئی تقریر۔ ماخوذ از ماہنامہ ''صبح صادق''، لکھنؤ، (شمارہ مارچ ۱۹۵۶ء) و پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ (شمارہ ۱۰ر نومبر ۱۹۹۸ء)۔

جس شاخ پر ہم نے نشیمن بنایا ہے
آج ہم اسی پر آری چلا رہے ہیں

بعض اوقات برسوں بعد ایسا زمانہ آتا ہے کہ انسان کسی شدید بیماری سے دوچار ہوتا ہے، یوں تو انسان بیمار ہوکر، اچھا ہوکر، بھوکا ہوکر، بھوک کا اظہار کر کے، کھانے کا محتاج بن کر اپنی انسانیت کا اظہار کرتا ہے، اور اپنی انسانیت کا ثبوت دیتا ہے، لیکن جس کو بحرانی کیفیت کہتے ہیں، ہسٹریا کا حملہ کہتے ہیں، اور کبھی پوری انسانی سوسائٹی جس کا شکار ہو جاتی ہے اور یہ کبھی صدیوں کے بعد ہوا کرتا ہے، بعض مخصوص اسباب کی بنا پر کچھ عوامل ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں، اس وقت لوگوں کو خیال نہیں ہوتا کہ وہ کیا عمل کر رہے ہیں، ان کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے، بہت سے لوگ ان پر نوٹس لینے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں، لیکن یہ عوامل، یہ Factors اپنا کام کرتے رہتے ہیں، اور پھر وہ کام کرتے کرتے جس طریقہ سے ہر چیز کی ایک ترقی کی منزل ہوتی ہے، وہ ایسی Develop ہوتی ہے کہ اس کا حملہ ہسٹریا کی طرح ہوتا ہے، اور وہ اچانک ہی ہوتا ہے اور بہت شدید ہوتا ہے، آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا ہے، اس کا مادہ جو کئی دنوں سے تیار ہو رہا تھا، انسان کا جسم اس کی موافقت کرنے سے، اس کو Reject کرنے سے، اس کا مقابلہ کرنے سے ہار گیا تھا، اس کے سامنے ہتھیار

ڈال چکا تھا، یہاں تک کہ اس بیماری کا پوری طرح قبضہ ہو گیا۔

حالات غیر معتدل اور غیر معمولی

تو اس وقت جو حالات ہمارے ملک اور پوری دنیا میں رونما ہیں، وہ غیر معتدل اور غیر معمولی ہیں، لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں، اور آپ میں سے سبھی حضرات تعلیم یافتہ ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ حالات اچانک ایکسیڈنٹ کی طرح رونما نہیں ہوئے بلکہ یہ ارتقاء کا، Evolution کا نتیجہ ہیں جو سیکڑوں برس سے کام کر رہا تھا، ان بیماریوں کی رفتار کم و بیش ہوتی رہتی ہے، بعض مرتبہ موٹر کی رفتار سے، تو بعض مرتبہ ایٹمک انرجی کی رفتار سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔

اس وقت جو بنیادی حالات ہمارے ملک کو درپیش ہیں، یہ اچانک نہیں پیدا ہو گئے، آپ کو شاید تعجب ہو یا آپ اسے خلاف توقع بات سمجھ رہے ہوں، لیکن میں اس پر کسی حیرت و استعجاب کا اظہار نہیں کرتا، مجھے ان حالات سے بالکل تعجب نہیں، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ میں ان حالات سے مایوس بھی نہیں اور مجھے ان سے زیادہ تکلیف بھی نہیں، یہ حالات تو میرے نزدیک زندگی کی علامت ہیں، یہ حالات تو پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور رونما ہوتے رہتے ہیں، ہماری تاریخ کا جتنا ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے، یہ خود بتاتا ہے کہ انسان فرشتوں کی طرح یا ایسے بے نفس انسانوں کی طرح نہیں ہو گیا جس کے اندر شر کی صلاحیت ہی نہ ہو، بلکہ وہ خیر مجسم بن گیا ہو، اس کے اندر سوائے خیر خواہی اور خیر طلبی کے کوئی صلاحیت ہی نہ رہی ہو، تاریخ میں ایسا کوئی دور نہیں گزرا، اگر گزرا بھی ہے تو وہ کسی پیغمبر کی کوشش، کسی بڑے مصلح کے تگ و دو سے، لیکن اس کا رقبہ بھی محدود تھا، اس کا زمانہ بھی محدود تھا، یہ نہیں رہا کہ صدیوں تک یہ صورت حال قائم رہی ہو، اور ساری دنیا پر، پورے کرۂ ارضی پر اس کا اثر ہو، ایسا نہیں ہوا، عموماً ہر زمانے میں اکثریت متوسط درجے کے لوگوں کی رہی ہے، Genius قسم کے لوگ ہر دور میں بہت کم

ہوتے ہیں اور اس زمانے میں بھی کم ہیں۔

ہمارے ملک میں جو اس وقت انتشار ہے، دولت پیدا کرنے کا بحران ہے، اس وقت جو خودغرضی ہمارے اوپر چھائی ہوئی ہے، اس وقت جو دولت کی پیاس اور بھوک اس قدر بڑھ گئی ہے کہ آدمی دیوانہ ہوگیا ہے، اس وقت جو کرپشن پھیلا ہوا ہے، اس وقت ذخیرہ اندوزی کا جو دوردورہ ہے، اس وقت نفسی نفسی کا جو دوردورہ ہے، فرض شناسی کا فقدان ہے، اس وقت دیانت وامانت کا فقدان ہے، ادائے فرض کا کوئی احساس نہیں، مجھے اس پر زیادہ دکھ بھی نہیں ہے، میں اس صورت حال سے بالکل مایوس نہیں ہوں۔

میری بات خلاف توقع ہوگی

میں پھر عرض کروں گا کہ میری ہر بات آپ لوگوں کے لیے بالکل خلاف توقع ہوگی، میں گویا جان بوجھ کر اپنے کاز کو نقصان پہنچا رہا ہوں، میری اس وقت یہاں حاضری کا جو مقصود ہے، اسے نقصان پہنچا رہا ہوں، میں گویا وکیل حریف کے سارے دلائل بیان کررہا ہوں، آپ کے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے نامور جج جسٹس محمود کے متعلق میں نے سنا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ اپنی ذہانت کے جوش میں اپنے موکل کے خلاف تمام دلائل دینے شروع کردیے، تھوڑی دیر بعد ان کے کسی جونیر وکیل نے یا رفیق کار نے ان کو متوجہ کیا کہ حضور! یہ تو آپ اپنے موکل کے خلاف تمام دلائل مہیا کررہے ہیں، اور اپنے فریق مقابل کو جتا رہے ہیں، تو انہوں نے ایک دم سے رخ بدلا اور کہا کہ میں نے ابھی تک جو دلائل پیش کیے ہیں، یہ میرے فریق کے حق میں جو بہتر سے بہتر دلائل دیے جاسکتے تھے وہ یہی دلائل ہیں، ان سے بہتر دلائل نہیں دیے جاسکتے، اب میں ان کا توڑ کرتا ہوں، اور ان کی تردید کرتا ہوں، اور فوراً عدالت کا رنگ بدل گیا اور رخ دوسری طرف ہوگیا، تو آپ تھوڑی دیر کے لیے یہ محسوس کرنے لگیں کہ میں اپنے مقدمے کو ہرا رہا ہوں، کیوں کہ میں یہاں یہ کہنے آیا تھا کہ حالات نہایت نازک ہیں، نہایت خراب ہیں، اس میں ہمارا معاشرہ،

ہمارا سماج، ہماری سوسائٹی کیا رول ادا کرسکتی ہے؟ کس طرح اسے روک سکتی ہے؟ یہ جو ہماری طرف ایک لاوا، ایک خوفناک طوفان بڑھ رہا ہے، اس کو ہم کس طرح روک سکتے ہیں؟ لیکن میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہے، اور اس صورت حال پر زیادہ دکھ بھی نہیں ہے، مایوس بھی نہیں ہوں، تو یہ بالکل توقع کے خلاف ہے، اور یہ تو اپنے موضوع ومقصد سے ایک طرح کی بیوفائی ہے۔

لیکن حضرات! نہ تو میں اپنے ساتھ بے وفائی کررہا ہوں اور نہ اپنے موضوع کے ساتھ، مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ یہ سب تو زندگی کی علامت ہے، انسان انسان ہے، انسان سے یہ توقع کرنا کہ وہ فرشتہ بن جائے، اس کے اندر دولت کی قدر نہ ہو، اس کے اندر آسائش کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش نہ ہو، یہ تو گویا انسان کی زندگی کو ختم کردینا ہے، اور انسان کا گلا گھونٹ دینا ہے، انسان کی امنگوں کا، اس کی صلاحیتوں اور اس کی حوصلہ مندیوں کا گلا گھونٹ دینا ہے، اگر انسان کو مہذب، آرام دہ اور منظم زندگی گزارنے کا شوق ہے تو اس شوق پر تعجب نہ کرنا چاہیے، اور نہ پیشانی پر شکن آنی چاہیے، اور نہ لبوں پر تبسم آنا چاہیے، اور نہ حقارت ونفرت کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے، اور نہ کوئی احتجاج کرنا چاہیے، میں تو ایک قدم آگے بڑھا کر کہوں گا کہ اس پر مبارک باد دینا چاہیے، کہ انسان زندہ ہے، انسان ذہانت رکھتا ہے، اس کے اندر انسانی احساسات ہر طرح بیدار ہیں۔

دنیا میں اس وقت جو کچھ ہورہا ہے مجھے اس پر تعجب نہیں ہے، لیکن مجھے اس وقت پوری دنیا سے بحث نہیں ہے، دنیا کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور ہمارا اور آپ کا وقت بہت محدود، ہماری قسمت ہمارے ملک سے وابستہ ہے، ہم کو یہیں جینا اور مرنا ہے، ہم اتنی بڑی دنیا کو سنبھال بھی نہیں سکتے، شاید اس کا ہم سے مطالبہ بھی نہیں ہے، مسلمانوں کی حیثیت سے، پیغمبروں کے جانشینوں کی حیثیت سے، اور ایک دردمند انسان کی حیثیت سے ہمارا تعلق پوری دنیا سے، پوری انسانیت سے ہے، لیکن میں اس وقت اپنے موضوع کو وسیع کرنا

نہیں چاہتا، بلکہ اپنے دائرہ کو تنگ رکھنا چاہتا ہوں۔

خاص عوامل اوران کے ارتقاء کا نتیجہ

تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ حالات حاضرہ سے نہ میں بددل ہوں اور نہ مایوس، یہ جو کچھ ہورہا ہے طبعی طور پر ہورہا ہے، خاص عوامل اور ان کے ارتقاء کا یہ نتیجہ ہے اور یہی ہونا چاہیے، مجھے تعجب صرف دو چیزوں پر ہے، ایک تو یہ کہ یہ چیز حدود کو پھلانگ جائے اور اس میں اجتماعی مفاد اس طرح پس پشت ڈال دیا جائے کہ گویا اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے، یعنی دولت مند بننا، یہ جذبہ کوئی بری چیز نہیں ہے، یہ ہمیشہ رہا ہے، دنیا کی ترقی اور چہل پہل اسی جذبہ کی رہین منت ہے، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اگر یہ جذبہ انسانوں میں نہ ہوتا تو تمدن اور سائنس اتنی ترقی نہ کرتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارا ادب، ہماری شاعری ترقی نہ کرتی، اس لیے کہ ہمارے ادب و شاعری کو بھی اسی سے غذا ملتی ہے۔

انسان کے اندر بڑا بننے کا جذبہ فطری ہے، اس کے اندر مسابقت کا جذبہ طبعی طور پر ہے، وہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتا ہے، اس کے اندر احساس جمال ہے، اس کے اندر حسن کا احساس ہے، اس کے اندر کمال کی قدر ہے، علم و ادب، شاعری و فلسفہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

دو چیزیں قابل شکایت اور قابل فکر

البتہ دو چیزیں قابل شکایت بھی ہیں اور قابل فکر بھی، اس کی وجہ سے اگر ہمارے اور آپ کے اندر فکر پیدا ہو، ہماری اور آپ کی نیند پر اس سے اثر پڑے، ہمارا اور آپ کا سکون اس سے متاثر ہو تو وہ بالکل بجا ہے اور حق بجانب ہے۔

ایک تو یہ کہ انسان کی یہ خواہش اندھی اور بہری ہوجائے، اور وہ ان خواہشات کے پیچھے مجنوں اور دیوانہ اور مدہوش ہوجائے کہ ہر قیمت پر دولت مند بننا چاہے، ہر قیمت پر آسائش کی زندگی گزارنا چاہے، ہر قیمت پر سرمایہ دار ہونا چاہے، اور وہ یہ چاہے کہ کم سے

کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت اس کے پاس جمع ہو جائے، ایک رات میں لکھ پتی کروڑ پتی بن جائے۔

آپ اگر دنیا کی اخلاقی تاریخ کا مطالعہ کریں، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ایسی کوئی تاریخ لکھی ہی نہیں گئی جس میں دنیا کی ترقی کو اور اس پر جو واقعات پیش آئے ہیں اور انسانوں میں جو رجحانات کام کرتے ہیں، ان کو اخلاقی پیمانے سے ناپا گیا ہو، کوئی ایسا اخلاقی تھرمامیٹر نہیں رہا، لیکن اگر آپ خود دنیا کی اخلاقی تاریخ کا کوشش اور ذہانت سے مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا کو اس جذبے سے اتنا نقصان نہیں پہنچا، حق حاصل کرنے کے جذبے، دولت حاصل کرنے کے جذبے نے انسانیت کو کبھی کوئی بہت بڑا نقصان نہیں پہنچایا، یہ چیزیں تو اوسط درجہ کے لوگوں میں ہمیشہ رہی ہیں، بلکہ بہت سے نیک انسانوں میں بھی رہی ہیں، پیغمبروں کی تربیت کی ہوئی جماعت میں بھی رہی ہے، لیکن نقصان جس چیز سے پہنچا وہ اندھا دھند دولت کی خواہش اور کم سے کم وقت میں آنکھ بند کر کے سرمایہ دار بن جانے کا یہ جذبہ بڑا مضر ہے، یہ تباہ کن و مہلک جذبہ ہے، آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں جو بڑی جنگیں ہوئی ہیں، دنیا میں جو تباہی و بربادی پھیلی، وہ ان لوگوں کے ہاتھوں نہیں ہوئیں جن کے اندر متوسط درجہ کا دولت مند بننا، آسائش کے ساتھ زندگی گزارنا اور اپنی ضروریات مہیا کرنے کا جذبہ تھا۔

دنیا کی تباہی ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہوئی جو اپنی خواہشات کے پیچھے اندھے اور بہرے ہو کر پڑ گئے، یہ خونی لکیریں جو آپ کو تاریخ کی پیشانی پر نظر آتی ہیں، تاریخ کے اندر جو ایک دور کو دوسرے دور سے ممتاز کرتی ہیں، اور جو ملک کو ملک سے، قوم کو قوم سے، ایک ریاست کو دوسری ریاست سے، برادری کو برادری سے، ایک فرقے کو دوسرے فرقہ سے، اور ایک فرقے کے مختلف اجزاء کو ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں، اور یہ خونی لکیریں انسانوں کے گرم، تازہ اور گاڑھے خون سے کھنچی ہوئی ہیں، یہ لکیریں ان لوگوں کی بنائی ہوئی ہیں جن کے اندر یہ جذبہ جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا، اور جنھوں نے تمام انسانی

مفادات، اجتماعی مصلحتوں، انسان کے مستقبل کو، انسان کے حق کو، سب کو چیلنج کیا تھا، ان سے انکار کیا تھا، اور ان کو ٹھکرا دیا تھا، سب کو پامال کر دیا تھا، سب کا گلا گھونٹ دینے کی کوشش کی تھی، یہ جو بڑے بڑے کشور کشا، بڑے بڑے فاتح آپ کو نظر آتے ہیں، وہ اس لیے نہیں ہوئے تھے کہ بقدر ضرورت دولت حاصل کریں، بقدر ضرورت طاقت حاصل کریں، بقدر ضرورت اپنے ملکوں کو عزت دیں، بقدر ضرورت اپنے ملکوں کی حفاظت کریں، بقدر ضرورت اپنے ملکوں سے غیر ملکی اقتدار ختم کریں، غیر ملکی غاصبوں کو اپنے ملک کی سرزمین سے نکالیں، یہ تو بہت پاک مقصد تھا، اس زمانے کے دیندار، اس زمانے کے فلسفی اور دانشور اس کی تعریف کرتے، کون اس سے انکار کر سکتا تھا، ہمارے ملک پر انگریز قابض تھے، ان کو اس ملک پر قبضہ کرنے کا کیا حق تھا؟ جو لوگ اس کے خلاف برسر پیکار ہوئے وہ ایک نہایت مقدس فرض کو ادا کرنے کے لیے اٹھے تھے، ہر شخص نے ان کی پیٹھ ٹھونکی، ان کو شاباشی دی، وہ کون سا نامراد، کون سا وطن دشمن، کون سا بدنصیب تھا جس نے اس کی مخالفت کی؟ یہ جذبہ تو ہر زمانہ میں نہایت پاکیزہ، نہایت مقدس، قابل احترام اور ہر طرح سے قابل داد تھا، اس سے نہ کبھی نقصان پہنچا ہے اور نہ پہنچ سکتا ہے۔

میں ایک طالب علم کی حیثیت سے چیلنج کرتا ہوں اور دعویٰ کرتا ہوں کہ آپ دکھا دیں کہ کبھی ملک کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے جو بھی کوششیں کی گئیں، ان سے کسی تحریک کو نقصان پہنچا ہو، اور کسی تمدن کو کوئی نقصان پہنچا ہو، لیکن یہی کوششیں جب حدود کو پھلانگ جاتی ہیں اور وہ خونریزی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، اور ہسٹریا کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں، تو پھر دنیا میں وہ تباہی و بربادی نازل ہوتی ہے جس کے تصور سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ تباہی اتنی ہی زیادہ عام ہوتی ہے جتنے وسائل اس تحریک کے علمبردار کے پاس ہوتے ہیں، علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک

جب یہ خونی سیلاب آتا ہے تو تمام تہذیبیں، ہر قسم کا تمدن، ہزاروں برس کے جمع کیے ہوئے خزانے، ہزاروں برس کی جمع کی ہوئی کتابیں جن کے لیے دانشوروں نے اپنی آنکھیں پھوڑی تھیں، راتوں کو جاگ کر محنتیں کی تھیں، شاعروں کے ضخیم ضخیم دیوان جن کو انہوں نے اپنے خون جگر سے مرتب کیا تھا، اور جو انسانی ذہانت کے عمدہ نمونے تھے، دم کے دم میں بالکل خاک سیاہ ہو جاتے ہیں، اور پورا شہر ہی نہیں بلکہ بعض اوقات پورا ملک ملبے میں تبدیل ہو جاتا ہے، اس لیے مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے، اور نہ میں اپنے بھائیوں سے اس بناء پر مایوس ہوں کہ وہ کامیاب زندگی گزارنے کی خواہش کر رہے ہیں۔

اجتماعی مفاد نظر انداز

لیکن مجھے افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اجتماعی مفادات کو بالکل نظر انداز کر دیں، اور اجتماعی مفادات کے ملبے اور قبر پر اپنے ذاتی اغراض کی نئی عمارت تعمیر کریں، جب کسی شہر یا کسی سماج یا سوسائٹی میں یہ مرض پیدا ہو جائے یعنی ان کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ انسانوں کی لاشوں پر گزر کر ہم کو آرام حاصل کرنا ہے، ہمیں عام انسانوں کے جذبات کو کچلتے ہوئے، ان کے جائز مطالبات کو ٹھکراتے ہوئے، ان کی زندگی کے تقاضوں کا انکار کرتے ہوئے، ان کے بچوں کو یتیم بناتے ہوئے، اور ان کی عورتوں کو سوگوار اور بے یار و مددگار کرتے ہوئے اپنی ضروریات مہیا کرنی اور اپنی خواہشات پوری کرنی ہے، تو یہ جذبہ خطرناک ہے، جب کسی سوسائٹی میں یہ زہر پیدا ہو جائے تو وہ سوسائٹی، وہ جماعت زیادہ دن دنیا میں رہنے کے قابل نہیں رہ جاتی، بلکہ یہ جذبہ پوری قوم، پوری انسانیت کو ہلاک و برباد کر ڈالتا ہے۔

سوسائٹی ہمیشہ ان لوگوں کے پاؤں کے نیچے کچلی گئی ہے، روندی گئی ہے، جو بالکل مست ہاتھی کی طرح رہتے تھے، جن کا نصب العین یہ تھا کہ ہمیں تو دولت حاصل کرنی ہے،

ہمیں تو عزت پیدا کرنی ہے، ہمیں تو وزارت حاصل کرنی ہے، خواہ اس کی قیمت کچھ بھی ہو، ہر قیمت پر اس کو حاصل کرنا ہے، اس لیے وہ اپنے گاؤں، شہر، قصبہ، بلکہ اپنی سوسائٹی و جماعت کو داؤ پر لگا دیتے ہیں، اور تمام انسانوں کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے قربان گاہ پر چڑھا دیتے ہیں۔

یہی مرض پیدا ہو گیا ہے

یہی مرض کچھ دنوں سے ہمارے اندر بھی پیدا ہو گیا ہے، یہ مرض بڑا مہلک و خطرناک ہے اور جو کچھ آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، عام زندگی میں جو ناہمواری اور بے اعتدالی ہے، سب کچھ ہوتے ہوئے ہمیں کچھ نہیں مل رہا ہے، ہمیں اس پر یقیناً اتنا افسوس نہ ہوتا اگر یہ ملک زراعتی ملک نہ ہوتا، ہمیں غلہ نہ ملنے پر اتنا افسوس نہ ہوتا اگر ہمارے اس ملک کے وسائل محدود ہوتے، یہاں کھیتی نہ ہوتی، اتنا بڑا ملک ہم کو نہ ملا ہوتا، آبادی بہت لیکن ملک چھوٹا سا ہوتا، اگر ہمارے ملک میں قدرت کی عطیات اور اللہ کی نعمتیں نہ آتیں جیسا کہ یورپ کے بہت سے ملک ہیں، وہاں سب کچھ ہے مگر پیدائش بہت کم ہوتی ہے، آپ وسط یورپ جائیے، آپ کو وہاں ایسے چھوٹے چھوٹے ملک ملیں گے کہ جن کے یہاں وسائل کی بہت کمی ہے، لیکن اس کے باوجود وہاں یہ بے چینی و قلق نظر نہیں آتا ہے۔

آپ ہی بتائیے، آپ میں سے یہاں بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں، کہ ہمارا ملک زراعتی ملک نہیں ہے؟ کیا یہاں وسائل زندگی کی کمی ہے؟ کیا یہاں دریاؤں کی کمی ہے؟ کیا یہ ایک بنجر اور چھوٹا سا ملک ہے؟ ہمارے ملک میں کس چیز کی کمی ہے؟ خدا کی قدرت، خدا کی سخاوت نے اس ملک کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کو قدرتی خزانوں سے مالا مال کر دیا ہے، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں یا کہتے ہیں کہ اس ملک کی ابتری، غذائی اشیاء اور دوسری ضروریات زندگی کی کمی کی وجہ سے ہے تو میں ان کو چیلنج کرتا

ہوں کہ وہ اس ملک سے واقف نہیں ہیں، ان کو اپنے ملک کی قدر نہیں، انہوں نے اپنے ملک کو دیکھا نہیں ہے، میں نے اس ملک کو خوب دیکھا ہے، شاید اس مجمع میں کم ہی آدمی ہوں گے جنھوں نے میری طرح اس ملک کی سیاحت کی ہے، میں نے مختلف اسباب کی بناء پر اس ملک کو چھان ڈالا ہے، مجھے سیر وسیاحت کا شوق بھی ہے اور اس کے مواقع بھی ملتے رہے ہیں، اور بعض وفود کے ساتھ بھی دورہ کرنا پڑا تو حیران رہ گیا کہ اللہ اکبر! کتنا لق و دق ملک خدا نے ہم کو عطا کیا ہے، یورپ میں مجھے یاد ہے کہ اگر آدمی ذرا سی بے احتیاطی کرے، موٹر ذرا تیز چلائے تو اس کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے حدود کو چھوڑ کر دوسرے ملک کی سرحد میں داخل نہ ہو جائے۔

جنیوا کا ایک واقعہ

مجھے یاد ہے کہ جنیوا میں ہم لوگ شام کو ہوا خوری کے لیے گے، ہمارے ساتھ ڈاکٹر حمید اللہ بھی تھے، (ہندوستان کے بہت بڑے اسکالر، وہ حیدرآباد کے رہنے والے تھے، ہندوستان کو تو ان پر فخر ہونا چاہیے، اس وقت وہ مانے ہوئے فرانس کے نیشنل ہیں) وہ ہمارے ساتھ تھے، ایک جگہ جا کر ہم کھڑے ہوئے، باتیں کرتے کرتے ذرا ہم آگے بڑھ گئے، انہوں نے کہا: بس، میں ذرا آگے قدم رکھوں گا تو فرانس پہنچ جاؤں گا، اور وہاں سے واپس نہ آسکوں گا، معلوم ہوا کہ جنیوا کے ہوائی اڈہ کا کچھ حصہ فرانس کے حدود میں ہے، اور کچھ حصہ سوئزرلینڈ میں، یہ تو ان ملکوں کی حقیقت ہے، اگر آپ وہاں بے تحاشا موٹر چلائیں تو آپ ملک کی سرحد پار کر جائیں گے اور آپ کو اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔

وسائل سے مالا مال ملک

برعکس اس کے آپ اس ملک کو دیکھیں، میں مدراس، کیرالا اور کرناٹک گیا ہوں، آپ اگر الہ آباد سے کالی کٹ جائیں تو آپ کو اس ملک کی حقیقت معلوم ہو جائے، اب اگر اس ملک میں غذائی کمی ہوتی یا اس ملک میں صلاحیت نہ ہوتی، یا اس ملک میں قدرتی

پیداوار نہ ہوتی، یا اس ملک کے لوگ ذہانت سے محروم ہوتے، محنت و صلاحیت سے محروم ہوتے، تو ہم کو تسلی ہو جاتی، اور ہم سوچتے کہ ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے، لیکن اللہ کی طرف سے کوئی کمی نہیں ہے، اس نے اس ملک کو سب کچھ دیا ہے، اس کی جھولی بھر دی ہے، اس ملک کا دامن پر کر دیا ہے، اور ایسا بھرا ہے کہ اس کا اٹھانا مشکل ہو گیا ہے، اور یہی دولت، یہی زرخیزی اس ملک کے لیے مصیبت بنی، سکندر کو کون سی چیز اس ملک کی طرف لائی؟ ترکوں اور مغلوں کو دین کے جذبہ نے اس پر آمادہ کیا تھا، میں اس کو مانتا ہوں، لیکن یہ ملک سونے کی چڑیا تھی، ان کا بھی جی چاہتا تھا کہ جائیں اور خدمت کریں اور اپنی ذہانت کے نمونے دکھائیں، اس ملک کی بھی خدمت کریں، تو کیا بیس پچیس برس کی مدت میں یہ دولتیں چھین لی گئیں؟ وہ کون سی رات تھی؟ کون سا دن تھا؟ وہ کون سی گھڑی تھی؟ خدا کے لیے جنتری دیکھ کر بتایا جائے، اخبارات کے فائل دیکھ کر بتایا جائے کہ وہ کون سی منحوس رات تھی کہ جس کی صبح کو معلوم ہوا کہ یہاں کی سب دولت ختم ہو گئی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ پریشانی کیوں؟ کیا یہ پریشانی اس وجہ سے ہے کہ ملک فقیر ہے، اس ملک میں خاک اڑ رہی ہے؟ کیا اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگ کھانا چاہتے ہیں، پینا چاہتے ہیں لیکن کمانا نہیں چاہتے؟ نہیں! یہ بات نہیں ہے، بلکہ اللہ نے یہاں کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی اسی لیے کی ہے کہ خود کھائیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی کھلائیں، خود پہنیں اور دوسروں کو بھی پہنائیں، لیکن کیا بات کہ یہاں بے شمار افراد کو دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی، پہننے کے لیے کپڑے نصیب نہیں ہوتے؟

یہ عشق یہ جنوں

صحیح بات یہ ہے کہ دولت کا عشق، دولت کا جنوں لوگوں پر سوار ہے، عشق آپ جانتے ہیں کہ اندھا ہوتا ہے، حکومت حاصل کرنے کا جذبہ بھی غیر قدرتی نہیں ہے، میرا یہ کہنا حقیقت پسندی کے بالکل خلاف ہوگا کہ انسان میں حکومت حاصل کرنے کا جذبہ

ہی نہیں ہونا چاہیے، لیکن جب حکومت حاصل کرنے کا جذبۂ عشق اس حد تک پہنچ جائے کہ اسے کچھ پرواہ نہ ہو کہ اس کے اس فعل سے ملک پر کیا گزر رہی ہے، اور لوگ مر رہے ہیں یا جی رہے ہیں، سارا ملک لاشوں میں تبدیل ہو جائے مگر ہماری کرسی محفوظ رہے، یہ بالکل غیر فطری جذبہ ہے، یہ شہوانی وحیوانی جذبہ ہے، یہ فرد و جماعت اور تمام ملک کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔

اگر کوئی حکومت حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کے نزدیک ملک کو ترقی دینے کے جو اصول ہیں، انھیں بروئے کار لانا چاہتا ہے، اور اسے کامیاب بنانا چاہتا ہے، اس کے ذریعہ سے اگر اپنے ہم وطنوں کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو وہ قابل مبارک باد ہے، شوق سے خدمت کرو، لیکن جب اس کے اندر یہ جذبہ جنون اور عشق کی حد تک پہنچ جائے، اس میں انفرادیت اور Ego ترقی کر جائے، انانیت اس میں اس قدر پیدا ہو جائے کہ وہ سب کی نفی کرے، اس کے نزدیک اگر کسی انسان کی قیمت ہے تو ووٹر کی قیمت ہے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے یہاں اگر الیکشن کی یہی حالت رہی تو وہ وقت آنے والا ہے جب کہ آدمی کے نزدیک ماں کی Value اسی وقت ہوگی، بیٹا اس کی قدر اسی وقت کرے گا جب وہ ووٹر ہو، اور بیٹے کو محبت کے قابل اسی وقت سمجھا جائے گا جبکہ وہ ووٹر ہو، اگر انسان ووٹر نہیں ہے تو بے عمل اور بے منفعت ہے، وہ اگر مر جائے تو اس کا کوئی افسوس نہیں ہوگا، اب وہ وقت آنے والا ہے جب کسی کو معلوم ہوگا کہ فلاں محلّہ میں فلاں شخص مر گیا ہے، تو وہ پوچھے گا کہ وہ میرا ووٹر تو نہیں تھا؟ اگر معلوم ہو گیا کہ وہ اس کا ووٹر نہیں تھا تو اس کی موت کا اسے کوئی صدمہ نہ ہوگا، تو جب ساری دلچسپیاں سارے احساسات سمٹ کر الیکشن کی سائیکالوجی میں آ جائیں تو انسان اس کی عینک سے ہر چیز کو دیکھے گا، اور اسی کے کان سے ہر چیز کو سنے گا، اسی کے ہاتھ سے ہر چیز کو چھوئے گا، تو پھر اس ملک کے لیے اس

سے بڑھ کر خطرہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

میں اپنی آواز نہیں پہنچا سکتا

حضرات! مجھے افسوس یہ ہے کہ میں اپنی آواز ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہیں پہنچا سکتا ہوں، میری قوت بھی محدود ہے اور میرے وسائل بھی، اور مجھ پر ایک چھاپ لگی ہوئی ہے جیسے کہ ابھی میرے ایک دوست نے کہا ہے کہ میں ایک مذہبی شخصیت سمجھا جاتا ہوں، تو میں ہزار بات انسانیت کی کہوں، واقعات وروزمرہ کی زندگی کی کہوں، لیکن میرے اوپر تو ایک ٹھپہ لگا ہوا ہے کہ میں ایک مذہبی انسان ہوں، میں اس سے برأت نہیں کرنا چاہتا ہوں، اور نہ دفاع کرنے کو تیار ہوں، بلکہ میں اس کو قبول کرتا ہوں، لیکن اس میں ایک Disadvantage یہ ہے کہ میری بات کو جتنا غور سے سننا چاہیے، ایک ایسے انسان کی بات جو انسان کے مسئلہ کو لے کر کھڑا ہوا ہے، اس میں فرق ہو جاتا ہے، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نہ جانے کہاں سے یہ آدمی موڑ دے گا اور تبلیغ کی بات شروع کر دے گا، یا معلوم نہیں کہاں سے اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے لگے گا، تو بھائی، اگر الیکشن میں ایک آدمی غلط سے غلط بات کہہ سکتا ہے، اور اپنی پارٹی کی حمایت کر سکتا ہے، تو میں جس مذہب کو صحیح سمجھتا ہوں، اگر اس کی تبلیغ کروں تو کیا برا ہے؟ لیکن میں اس وقت میں تبلیغ نہیں کروں گا، یہ موقع اس کا نہیں ہے، اور آپ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں، میں جو باتیں کہوں گا وہ آپ کے لیے جانی بوجھی ہوں گی، تو مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی آواز ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہیں پہنچا سکتا، لیکن آدمی اگر کسی سے نہ کہہ سکے تو کیا اپنے گھر والوں سے بھی نہیں کہہ سکتا ہے؟ اگر وہ اپنے دوستوں سے بھی نہ کہہ سکے تو وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گا، اس لیے میں کبھی کبھی اپنی زندگی باقی رکھنے کے لیے ایسے سننے والے کان اور ایسے دردمند دل چاہتا ہوں جو میرے باتوں کو سنیں اور غور کریں۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ اس وقت جو چیز اس ملک کے لیے سب سے زیادہ خطرناک

ہے، وہ ہمارا اجتماعی مفاد کو یکسر نظر انداز کرنا ہے، ایک سوسائٹی جب ہی اچھی زندگی گزار سکتی ہے جب اس کے ہر فرد کو کھانے کو ملتا ہو، اور سب کی ضروریات زندگی پوری ہوتی ہوں، جب سب ایک دوسرے پر اعتماد رکھتے ہوں، جب سب ایک دوسرے سے گھبراتے نہ ہوں، ایک دوسرے کو دشمن نہ سمجھتے ہوں، سانپ بچھو نہ سمجھتے ہوں، لیکن آج کل ہمارے معاشرے میں یہی چیزیں پیدا ہوگئی ہیں، خاص طور پر ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ دوررس نتائج نہیں بلکہ قریبی نتائج سے بے پرواہ ہوگیا ہے۔

طلبہ کی بے راہ روی

حالت تو اب یہ ہوگئی ہے ہمارا اسکول کا طالب علم اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس ٹرین پر بیٹھے ہوئے مسافروں کو کب پہنچنا ہے؟ کوئی اپنی بیمار ماں کو دیکھنے جارہا ہے، کوئی جاں بلب باپ کو دوا دینے کے لیے جارہا ہے، کوئی مہینوں بعد اپنے گھر جارہا ہے، اس کو اپنے گھر کے لوگوں سے ملنے کا کتنا شوق ہے، جگہ جگہ زنجیر کھینچنا، اپنے گاؤں یا قصبہ کے سامنے گاڑی روکنا، پھولدار باغ اگر نظر آجائے تو وہاں اتر کر باغ کا ستیاناس کر دینا، اس باغ کو جو نقصان پہنچا سو پہنچا ہی، اور ان مسافروں پر جو گزری وہ گزری، لیکن جب کسی ملک کی یہ حالت ہوجائے کہ اجتماعی مفاد سے بالکل آنکھیں بند کرلی جائیں، تو میں پیشین گوئی تو نہیں کرتا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہاں ترقی کی تمام کوشش بےکار ہے، اور یہ یونیورسٹیاں اور لائبریریاں و لیبارٹریز اور سارے تجربے واکتشافات اور ادب و شاعری کی ساری کاوشیں بیکار و فضول ہیں، اگر اس ملک میں یہ مرض اور ترقی کر گیا تو راستہ میں چلنا پھرنا مشکل ہوجائے گا، ریل پر سفر کرنا دشوار ہوجائے گا، دفتروں و کچہریوں سے حاجت براری مشکل ہوجائے گی، اسپتال سے دوا لینا اور مریض کو دکھانا مشکل ہوجائے گا، شادیوں اور تقریبات میں شرکت کرنا ناممکن ہوجائے گا، اور آخر میں نوبت یہ آئے گی کہ پیاسے کو پانی نہ ملے گا اور بھوکے کو روٹی نہیں ملے گی، اس ملک کو

سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ہر شخص آنکھیں بند کر کے اپنے مطلب کے پیچھے دیوانہ ہو گیا ہے، اور چاہتا ہے کہ رات کو سوؤں اور دن کو لکھ پتی بن جاؤں۔

سیاسی پارٹیوں کے سامنے صرف ایک حقیقت

ہماری سیاسی پارٹیوں کے سامنے صرف ایک حقیقت رہ گئی ہے کہ الیکشن کس طرح جیتا جائے اور اپنی پارٹی کو کس طرح برسر اقتدار لایا جائے، کس طرح حکومت کے وسائل پر قبضہ کیا جائے، اور جیسا کہ میں نے اس سے پہلے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ "اس سے کوئی بیزاری اور شکایت نہیں کہ کام غلط ہو رہا ہے، کہنا یہ ہے کہ یہ غلط کام ہماری نگرانی میں ہو"۔ ارے صاحب! کانگریس پارٹی کو بہت دن غلط کاری کرتے ہوئے ہو گئے اور اس ملک کو لوٹتے ہوئے، اب ہماری پارٹی کو موقع ملنا چاہیے، اور کانگریس پارٹی کہتی ہے کہ ہم نے ملک کو آزاد کرایا، اس لیے اس ملک کو لوٹنے اور اس سے فائدہ حاصل کرنے کا حق ہمارا ہے، جب یہ ذہنیت ہو جائے کہ ہمارا مطلب نکل جائے، ہمارا الو سیدھا ہو جائے، اور باقی دنیا پر خواہ کچھ گزر جائے، خواہ کچھ بھی بیتے، یہی ذہنیت آج کام کر رہی ہے، ملک کا کیا حال بنا رکھا ہے؟ کیا گت بنا رکھی ہے؟ غلہ یہاں موجود، زمین بھی نہایت سرسبز و شاداب، اس کے علاوہ ہمارے پاس کتنا بڑا ملک اور کتنی بڑی قوم ہے، اور پھر ہر صلاحیت کا آدمی اس ملک میں موجود ہے، اور یہ تسلیم کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے کہ سیاسیات وادبیات وسائنس اور صنعت و حرفت میں ہمارے ملک میں فرسٹ گریڈ کے لوگ موجود ہیں، لیکن ان سب کے باوجود ہمارے ملک کی یہ حالت ہو رہی ہے، کہ کوئی شخص مطمئن نہیں ہے، کسی کو کل کے متعلق یقین نہیں ہے کہ کل کیا ہوگا، گرانی کی ایک لہر چلی ہوئی ہے، اور ہر شخص ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس ملک کو ایک مرنے والی گائے کے مانند سمجھ رہا ہے کہ اس سے جتنا دودھ دوہا جا سکے دوہ لے۔

یعنی اب ہر ایک یہی تصور کر رہا ہے کہ اس سے جتنا فائدہ اٹھا سکو اٹھاؤ، یہ خطرناک

صورت حال ہے، یہ کسی ایسے بھی ملک کو زیب نہیں دیتا جس کی نہ کوئی تاریخ ہو، اور نہ کوئی ماضی ہو، اور نہ کوئی تمدن ہو، اور نہ روایات ہوں، ہمارا ملک تو قدیم تاریخی ملک ہے، ایک شاندار وسیع ادب وتمدن کا مالک ہے، اس نے علمی دنیا میں بہت بڑے بڑے فلسفی دانشور پیدا کیے، بڑے رشی اور منی پیدا کیے، مسلمانوں میں بھی اور ہمارے ہندو بھائیوں میں بھی ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کے کارناموں پر دنیا ہمیشہ فخر کرتی رہے گی، لیکن جب اس ملک کی یہ حالت ہو جائے کہ سب کے سب اپنے اپنے حال میں مست ہو کر آستین چڑھائے ہوئے اس مردے سے جو کچھ حاصل ہو سکے حاصل کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، تو اس کی کیا حالت ہوگی؟ اس ملک کو مردہ کرنے کے ہم ہی مجرم ہیں۔

کشتی ڈوبی تو ہم کہاں جائیں گے؟

جس شاخ پر ہم نے اپنا نشیمن بنایا ہے، جس پر ہمارا آشیانہ ہے، آج ہم اسی پر آری چلا رہے ہیں، اسی پر کلہاڑی چلا رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں، ہم اس کشتی کے ڈبونے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں جس پر ہمارا سارا سامان لدا ہوا ہے، ہماری اور ہماری اولاد کا مستقبل اسی کشتی سے وابستہ ہے، کشتی ڈوبی تو ہم کہاں جائیں گے؟ یہ ایک ایسا خطرہ ہے جس پر لوگوں کو سر پر کفن باندھ کر یہ کہنا چاہیے کہ ہمارے ملک کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کیوں کہ یہاں کے تمام باشندوں کو یہیں جینا اور مرنا ہے، ان کے لیے کہیں کوئی جائے قیام نہیں مل سکتی ہے۔

کہاں جاؤ گے؟

بہت سے ہمارے سیدھے سادے مسلمان بھائی تحریک خلافت کے زمانہ میں افغانستان گئے تھے، اور کہتے تھے کہ افغانستان ایک غیرت مند ملک ہے، مسلمانوں اور پٹھانوں کا ملک ہے، اور ان میں ایمانی جذبہ موجود ہے، اور افغان بڑے کریم النفس اور مہمان نواز ہیں، لیکن چند ہی دنوں میں معلوم ہو گیا کہ ہم نے غلطی کی تھی، اور پھر اپنے

گھروں کو واپس آئے، اور جو پاکستان چلے گئے تھے ان سے پوچھیے کہ کتنے آدمی مطمئن ہیں اور کتنے غیر مطمئن؟ جب پاکستان آنے جانے کی اجازت تھی تو میں کئی بار آیا گیا، میں نے اکثر لوگوں کو شاکی پایا، وہاں الہٰ آباد اور لکھنؤ کی گلیاں یاد آتی ہیں، اب آپ کا ٹھکانا کہاں ہے؟ اور ہمارے ہندو بھائی مجھے معاف کریں، ان سے میں صاف صاف کہوں گا کہ آپ کا ٹھکانا تو اور بھی کم ہے، ہم تو اللہ اور رسول کا نام لے کر، ان کی دہائی دے کر اور قرآن ہاتھ میں لے کر، اور یہ کہہ کر کہ ہم بھی کلمہ گو ہیں اور ہمارا تمہارا رشتہ ایک ہے، اور ہم میں سے بہت سے یہ بھی کہیں گے کہ ہم تو یہیں سے تو گئے تھے، ہمارے شیوخ اور سادات، صدیقی و فاروقی یہیں سے تو گئے تھے، اب پھر آگئے، ہمیں تو کہیں دوسری جگہ رہنے کی مل سکتی ہے، لیکن یہ کوئی زیادہ موثر بات نہیں ہے، مسلمان بھی غلط سوچ رہے ہیں اور آپ بھی غلط سوچ رہے ہیں، اگر مسلمان یہ سمجھ رہا ہے کہ اگر اور کہیں نہیں تو مکہ چلے جائیں گے اور وہ شعر جو پڑھا جاتا تھا:

میرے مولا بلا لو مدینہ مجھے

لیکن وہاں کے لوگ بھی کہتے ہیں کہ بھائی اپنے گھر خوش رہو اور ہم یہاں خوش رہیں، تم آؤ گے تو ہم کیسے تم کو سنبھالیں گے؟ ہمارے ملک کے وسائل بہت محدود ہیں، پٹرول ہے مگر وہ نہ کھایا جاسکتا ہے نہ پیا جاسکتا ہے، دنیا کے سیاسی حالات بدلتے رہتے ہیں، جو پہلے حالات تھے وہ اب نہ رہے، وہ کہتے ہیں کہ یہاں گنجائش نہیں، بیشک وہ بہت شریف لوگ ہیں اور وہاں جا کر لوگ رہ بھی جاتے ہیں، مگر پانچ کروڑ، سات کروڑ بلکہ ہمارے بہت سے احباب لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد اس سے زیادہ ہے، یہ کہاں جائیں گے؟ افغانستان اور ایران کا سوال نہیں، پاکستان کا بھی سوال نہیں، اس کا پیالہ تو بھر چکا، لبریز ہو چکا، اس کا پیالہ چھوٹا تھا اور وہ لبریز ہو گیا، اب سیاسی پارٹیوں اور یہاں کے باشندوں نے کیا سوچا ہے کہ اگر یہ ملک تباہ ہو گیا تو ان کا کیا ہوگا؟ کیا انھیں نیپال قبول کر

لے گا؟ نیپال کی حقیقت ہی کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ ہمارے تعلقات باہر کے ملکوں سے کہاں بہت اچھے ہیں، بدھ ازم کو جو آپ لوگوں نے یہاں نکال دیا تھا، تو اب کس امید پر وہاں جائیں گے؟ تو کہیں آنے جانے کا سوال ہی نہیں، آپ کو، ہم کو، سب کو یہیں رہنا ہے، لیکن آپ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ ملک برباد ہو رہا ہے۔

دو طاقتیں

لیکن دو چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جو آدمی کو حد سے بڑھنے سے روکتی ہیں۔ ایک تو وہ چیز جس پر میرا گہرا عقیدہ ہے، وہ مذہب ہے، اور مذہب کی تعلیم یعنی خدا کا خوف، مرنے کا خیال اور خدا کے سامنے حساب و کتاب پیش کرنے کا خیال، اور قبر کی منزل اور اس کا اندھیرا اور پُل صراط اور میدان حشر، اصل طاقت تو اس میں ہے، اگر یہ بات ہوتی تو اس طرح کے واقعات پیش آئیں گے جیسا کہ آپ نے سنا ہوگا، ایک شخص کو مال غنیمت میں کئی لاکھ روپیے کی جواہرات میں سے کوئی چیز ملی، شہنشاہ ایران کا مرصع تاج ملا، جسے وہ اپنے دامن کے اندر چھپا کر لے جا رہا تھا، تاکہ اپنے کمانڈر انچیف حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے سامنے پیش کرے اور لے جا کر ان کے سامنے پیش کر دیا، امیر لشکر نے کئی مرتبہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھا کہ اللہ اکبر! ایسے بھی آدمی پائے جاتے ہیں کہ وہ خود رکھنے کے بجائے یہاں لے آیا! خیر یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، وہ زمانہ بڑی خیر و برکت والا تھا، اور رسول اللہ (ﷺ) کو دنیا سے تشریف لے جائے ابھی تھوڑا عرصہ گزرا تھا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جب انھوں نے اس کا نام پوچھا تو اس بدو نے کہا کہ میں نے جس کے خیال سے یہ کام کیا ہے وہ میرا نام جانتا ہے، آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے، یہ کہہ کر سلام کیا اور چل دیا، یہ واقعات اس عقیدے کے نتیجہ میں پیش آئے ہیں، آپ نے سنا ہوگا کہ حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے، وہ گشت کر رہے تھے، اتنے میں ایک مکان سے گزرے تو انھوں نے سنا کہ ایک عورت کہہ رہی ہے: ارے بیٹی! دیکھ اجالا

ہونے والا ہے، دودھ میں پانی ملانے کی کاروائی کر، اس لڑکی نے جواب دیا کہ امی! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المومنین نے اعلان کیا ہے اور ان کا یہ آرڈی نینس ہے کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے، ماں نے جواب دیا کہ بیٹی اس وقت کون دیکھ رہا ہے؟ تو بچی نے کہا کہ اگر عمرؓ نہیں دیکھ رہے ہیں تو خدا تو دیکھ رہا ہے۔

تو اصل طاقت تو اس عقیدے میں ہے، لیکن ایک دوسری طاقت بھی ہے، کوشش تو یہ کرنی چاہیے کہ مسلمانوں میں یہ عقیدہ پیدا ہو جس کا ذکر میں کر چکا ہوں، اور ہمارے ہندو بھائیوں میں بھی یہ عقیدہ پیدا ہو، کہ خدا کوئی چیز ہے، وہ دیکھتا ہے۔

دوسری چیز جس کو یورپ نے اس کے ایک Substitute کی حیثیت سے، ایک بدل کی حیثیت سے اپنایا ہے، وہ حب الوطنی Patriotism، سچی محبت، اپنے ملک اور وہاں کے باشندوں سے حقیقی تعلق ہو، یہ ایک ایسا خیال ہے جسے سب نے قبول کیا ہے، یہ ملک ہمارا ہے اس میں کوئی غلط کارروائی نہیں ہونی چاہیے، اس ملک میں کرپشن نہیں ہونا چاہیے، اس سے ملک کو نقصان پہنچے گا، اس ملک میں یہ نہیں ہوسکتا کہ استحقاق Priority اور Merit ایک کو حاصل ہو، اور ہم ترقی کسی اور کو دیں، یہ نہیں ہوسکتا، اس سے حکومت اور سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہوتا ہے، یہ بہت سطحی خیال ہے۔

اور اس مذہبی عقیدے کے مقابلے میں اس کی جڑیں اتنی مضبوط اور گہری نہیں ہیں لیکن بہر حال یہ بھی مفید چیز ہے، یورپ آج اسی خیال اور عمل سے تھما ہوا ہے، یقیناً آپ میں کئی حضرات ایسے ہوں گے جنھوں نے یورپ کا سفر کیا ہوگا، وہ جانتے ہیں کہ یورپ میں کوئی چیز آپ کہیں چھوڑ دیں، وہاں Loss Property کے لیے ایک جگہ ہے، وہاں تمام گم شدہ چیزیں مل جاتی ہیں، اس کی ایک فیس مقرر ہے، وہ آپ کو دینی ہوگی، مثلاً اگر آپ اپنا پرس کہیں بھول گئے ہیں تو وہ آپ کو وہیں مل جائے گا، اس طرح کے واقعات وہاں روزمرہ ہوتے رہتے ہیں، یورپ کے عوام کوئی بہت بڑے صوم وصلوۃ کے پابند نہیں

ہیں، اور خدا ترس لوگ نہیں ہیں، اور نہ سچے عیسائی ہیں، لیکن انہوں نے ایک ایسی چیز، ایک پارس پتھر معلوم کرلیا ہے، اس وجہ سے یہ ملک اپنی بہت سی کمزوریوں اور خرابیوں کے باوجود اپنے محور پر رکا ہوا ہے، یعنی یہ نہیں کہ وہاں بغیر رشوت دیے کوئی کام ہی نہ بنتا ہو، ہمارے یہاں تو رشوت کی مقدار فیسوں کے نام سے مقرر ہے، آپ کہیں جائیں کام کی نوعیت کے اعتبار سے کم وبیش یہ فیس آپ کو دینی ہوگی، رشوت یہاں ایک کاروبار بن گیا ہے، یورپ میں یہ باتیں نہیں ہیں، وہاں اور بہت سی خرابیاں ہیں، وہاں بہت گناہ ہوتے ہیں، جو نہ ہونا چاہیے وہ ہوتا ہے، وہاں عیش وعشرت کی فراوانی ہے، لیکن حکومت کے ضوابط وقوانین اور کیریکٹر کے حدود، ان کی وہ پوری پابندی کرتے ہیں۔

نہ یہ نہ وہ

اب آپ ہی بتائیے کہ اگر کسی ملک میں یہ دونوں باتیں نہ ہوں، نہ تو مذہبی عقیدہ، کیوں کہ اس کی طاقت ختم ہو چکی، خواہ کسی وجہ سے ہو میں اس کی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا، کیوں کہ اس کی ذمہ داری مجھ پر اور میرے گروہ پر بھی ہے، ہم نے اس عقیدے کو مضبوط بنانے کی، غذا پہنچانے کی پوری کوشش نہ کی، اس کو پانی ہم نے نہیں پہنچایا، اس میں ہمارے مذہبی گروہ کی بہت بڑی کمزوری ہے، اب کچھ لوگ کوشش کر رہے ہیں، اسی طرح ہمارے غیر مسلم بھائیوں میں بھی پوری کوشش نہیں ہوئی، عرصہ تک اس طرح کی کوئی کوشش نہیں ہوئی جس سے مذہب کی جڑیں مضبوط ہوں، مستحکم ہوں۔

اور دوسری طرف سچی حب الوطنی شاید ہمارے یہاں پیدا ہی نہیں ہوئی، اخلاقی تربیت کا جو زمانہ تھا وہ تو انگریزوں سے لڑنے میں گزر گیا، اور اس کے بعد کا دور آزادی و حکومت سے فائدہ اٹھانے کا آیا، اس لیے بیچ کا دور جس میں ہم قوم کو تیار کرتے ہیں، Nation کو تیار کرتے، سوسائٹی کو تیار کرتے، وہ ہم نہیں کر سکے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے یہاں سچی حب الوطنی نہیں پائی جاتی ہے، کوئی شخص کسی غلط کام سے اس لیے نہیں

رکتا کہ اس سے ہندوستان کو نقصان پہنچے گا، پروجیکٹ ہیں لیکن ناکام، اسکیمیں ہیں لیکن فیل، ان میں ٹھیک سے میٹریل ہی نہیں لگتا، اس میں جو ضروری احتیاط کرنی چاہیے وہ نہیں ہو پاتی، ملک کا پیسہ برباد ہو رہا ہے، وقت زیادہ لگ رہا ہے، میں آپ کے سامنے اس کی مثالیں دے سکتا ہوں، لیکن وقت میں اس کی گنجائش نہیں ہے، حالت یہ ہوگئی ہے کہ دو دن میں جو کام ہو سکتا ہے چھ مہینہ لگ جاتے ہیں، لوگ کام نہیں کرتے، دفتروں میں عملہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے گپ کرتا رہتا ہے، دیر میں آتے ہیں اور جلد چلے جاتے ہیں، درمیان میں لنچ ٹائم اور ٹی ٹائم ہوتا ہے، کسی کو اس ملک سے سچی محبت اور لگن نہیں ہے، جرمن قوم کو آپ دیکھیں، دوسری جنگ نے جرمنی کے پرخچے اڑا دیے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد جب وہاں گئے تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، انھوں نے جرمنی کے بارے میں جو اپنا تاثراتی بیان دیا تھا اس میں کہا تھا کہ میں جرمن قوم کی صلاحیت پر ایمان لے آیا، میں مان گیا کہ جرمن قوم زندہ رہنے کی مستحق ہے۔ ایک ہمارا ملک ہے کہ پچیس سال آزادی ملے ہو گئے، مگر جو چیز جہاں تھی وہیں ہے، حالانکہ کسی بات کی کمی نہیں ہے۔

دولت پیدا کرنے کا بھوت سوار ہے، تعلیم یافتہ لوگ اس کے زیادہ مجرم ہیں، اور سب کی توجہ حکومت پر ہے، پارٹی پالیٹکس پر ہے، انتظام درست کرنے پر کسی کی توجہ نہیں ہے، آج ہمارے مرکز کا حکمراں طبقہ ہر وقت جوڑ توڑ میں لگا رہتا ہے، دوسرے ملکوں کے ساتھ بھی جوڑ توڑ میں اور اپنی پارٹی کے اندر بھی جوڑ توڑ میں، اور دوسری سیاسی پارٹیوں کو بھی جوڑنے اور توڑنے میں مصروف، ایڈمنسٹریشن پر، اخلاقی قدروں اور نظام تعلیم کے درست کرنے پر کوئی توجہ نہیں، لوگوں کو ان کی ضروریات مہیا کرنے پر اور ان میں اعتماد پیدا کرنے پر جو توجہ دینی چاہیے، اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے، قوم کا اپنے ملک اور مستقبل پر اعتماد بحال ہونا ضروری ہے، ہر شخص اپنے مستقبل سے مایوس ہو رہا ہے، اپنے ملک سے مایوس ہو رہا ہے، اور نتیجہ یہ ہے کہ جن کے پاس وسائل ہیں، وہ لوٹ کھسوٹ اور پیسہ پیدا

کرنے میں لگے ہوئے ہیں، دولت پیدا کرنا جرم نہیں، مگر دولت کا بھوت سوار ہو جائے، یہ بات نظر انداز کرنے کے لائق نہیں۔

ایک تحریک کی ضرورت

دوسری بات جو بہت خطرناک ہے، وہ یہ ہے کہ اس ملک میں کوئی جماعت اور کوئی گروہ ایسا نہیں ہے جو اس صورت حال سے بے چین ہو جائے، اور اس کی راتوں کی نیند اڑ جائے، اس صورت حال کو ناپسند کرنے والے اس ملک میں لاکھوں ہیں مگر اس سے پنجہ آزمائی کرنے والا ایک بھی نہیں ہے، یہ بے حسی اور بے عملی بڑی خطرناک ہے، بارہا ایسا ہوا کہ بڑی بڑی جنگیں ہوئیں اور انھوں نے ملکوں کو تباہ کر دیا، بڑے بڑے مفسد لوگ پیدا ہوئے انہوں نے پورے ملک میں زہر پھیلا دیا، لیکن ایک جماعت کھڑی ہوئی اس نے ملک کا مزاج درست کر دیا، اس کی چول بٹھا دی، لیکن یہاں اس کے کوئی آثار اس وقت کم از کم نظر نہیں آرہے ہیں، کوئی پارٹی، کوئی ٹیم، کوئی تنظیم، کوئی ادارہ، کوئی Institute، یہاں تک کہ اللہ والوں کی کوئی جماعت مسلمانوں میں یا ہمارے ہندو بھائیوں میں ایسی پیدا نہیں ہوئی جو اس نازک صورت حال کے مقابلہ میں صف آرا ہو، مجھے اچاریہ ونوبا سے بڑی امید تھی، ان سے ملا بھی ہوں، عزت بھی کرتا ہوں، سرودے تحریک سے بڑی امید تھی کہ یہ خدمت خلق کا ادارہ ہے، لیکن اس ملک پر بڑی بڑی مصیبتیں آئیں، لیکن ان لوگوں نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی اور جو پریشانی اس وقت آئی ہے، اس کا مداوا، اس کا علاج کسی نے پیش نہ کیا، فرقہ وارانہ فسادات میں اخلاقی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے، حکومت باوجود کوشش کے اس پر کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔

اس لیے سب سے زیادہ تشویش کی بات یہ کہ اس پریشان کن و نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے والا کوئی نظر نہیں آرہا ہے، ملک کے گوشے گوشے میں یونیورسٹیاں ہیں، اعلیٰ تعلیم گاہیں ہیں Academies بھی ہیں اور ریسرچ بھی ہو رہا ہے، شعروشاعری بھی

ہو رہی ہے، عمدہ عمدہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں، بلکہ ایک علمی فضا سارے ملک پر چھائی ہوئی ہے، لیکن اگر کوئی کام نہیں ہو رہا ہے، تو وہ اخلاق درست کرنے والا کام ہے، انتظام درست کرنے والا، اعتماد بحال کرنے والا کام ہے، اور آپس میں محبت پیدا کرنے والا کام ہے، اور کوئی ایسی تبلیغ یا کوئی ایسی کوشش جس سے انسان کے جان کی قیمت معلوم ہو اور یہ معلوم ہو کہ انسان پر ہاتھ اٹھانا کتنا بڑا جرم ہے، کتنا بڑا پاپ ہے، ایسی دعوت و تحریک کہ جس سے معلوم ہو کہ انسان خدا کا بنایا ہوا ہے، جو اس پر ہاتھ اٹھائے گا گویا خدا پر ہاتھ اٹھائے گا، وہ خدا کی بڑی پیاری و محبوب چیز پر ہاتھ اٹھا رہا ہے۔(۱)

---

(۱) الہ آباد کے ایک مخلوط اجتماع میں کی گئی تقریر۔ یہ تقریر سعید احمد الہ آبادی ندوی نے قلمبند کی۔ ماخوذ از "تعمیر حیات" (شمارہ ۲۵/جون و ۱۰/جولائی ۱۹۷۴ء)۔